معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے — فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۲ ماہ اگست ۱۹۹۳ء مطابق ماہ صفر المظفر ۱۴۱۴ھ عدد ۲

مضامین

شذرات

دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کے صدر محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اور بعض موقر ارکان کے ضعف و معذوری کے باعث اس سال اسکی دونوں مجالس عاملہ و منتظمہ کے اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں ہوئے، مجلس عاملہ کا جلسہ ۷ اگست کو حضرت مولانا کی صدارت میں ہوا جس میں اسکے ارکان مولانا سید محمد رابع ندوی، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، جناب سید شہاب الدین دسنوی معتمد دارالمصنفین اور راقم شریک ہوئے، جلسہ میں دارالمصنفین کے مختلف شعبوں کے مسائل و ضروریات پر غور و خوض ہوا اور اسکے معیار و وقار کو بلند کرنے پر زور دیا گیا، بعض نئی عمارتوں کی تعمیر کا مسئلہ بھی پیش ہوا، اگر حالات مساعد رہے تو اسے جلد ہی شروع کر دیا جائیگا، سردست دارالمصنفین کی وقف کمیٹی کی منظوری سے اسکی مسجد کی توسیع کا کام متوکلاً علی اللہ شروع کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل فرمائے۔

مجلس انتظامیہ کے صدر محترم پرنس مکرم جاہ بہادر بالقابہ کے تشریف نہ لانے کی بنا پر اسکا جلسہ بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی صدارت میں ۸ اگست کو ہوا جس میں مذکورہ بالا ارکان کے علاوہ مجلس انتظامی کے ارکان میں مولانا محمد سعید مجددی (بھوپال) اور مرزا امتیاز احمد بیگ ایڈوکیٹ (اعظم گڈھ) نے شرکت فرمائی، خصوصی مدعو کی حیثیت سے مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی مہتمم تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جناب عبداللسان ہلالی جوائنٹ سکریٹری دارالمصنفین بھی شریک مجلس رہے، اس جلسہ میں دارالمصنفین کے علمی و انتظامی شعبوں کی رپورٹ ان کے ذمہ داروں نے پیش کی اور سالانہ بجٹ اور مجلس عاملہ کی تجویزیں پیش کی گئیں جو بحث و تمحیص کے بعد منظور کرلی گئیں، دارالمصنفین کے کتب خانہ میں انگریزی اور اردو کتابوں کا اضافہ تو بتدریج ہو رہا ہے لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے گذشتہ کئی برسوں سے عربی کتابوں کا اضافہ خاطر خواہ نہیں ہو سکا جس پر صدر محترم نے بجا طور پر تشویش ظاہر کی اور انکے حصول کے لیے بعض قیمتی اور مفید مشورے دیئے۔

معارف پریس میں طباعت کا کام ابھی تک لیتھو پر ہو رہا ہے لیکن اب اچھے کاتب اور پلیٹ بنانے والے نہیں ملتے، اس لیے طباعت کی رفتار اور معیار میں روز بروز فرق آتا جا رہا ہے علاوہ ازیں دارالمصنفین کی بعض مطبوعات عرصہ سے ختم ہوگئی ہیں جن کی مانگ برابر جاری ہے، اسکی اور خراب طباعت کی وجہ سے دارالمصنفین کی تجارت بھی متاثر ہوگئی ہے جس پر اس کا اصل انحصار ہے، مزید ستم یہ ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ کتابوں کو بعض خود غرض ناشرین شایع کرکے اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے کمپیوٹر سے کمپوزنگ کرکے طباعت کرانے کا فیصلہ کیا گیا، لیکن دارالمصنفین کے لیے فوری طور پر اس کے سلسلے میں ہونے والے مصارف کا متحمل ہونا بہت دشوار ہے، اس لیے طے پایا کہ فی الحال باہر سے کمپوزنگ کراکے طباعت کا کام موجودہ پریس ہی سے لیا جائے تاکہ دارالمصنفین کی نئی اور پرانی مطبوعات جلد طبع ہوسکیں۔

گذشتہ سال دارالمصنفین نے مشاہیر کے خطوط، سفرنامہ افغانستان اور الاسلام والمستشرقون (عربی) شایع کی تھیں اور اب الفاروق کا عکسی اڈیشن بھی عنقریب تیار ہو جائے گا، یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی اور اسے غیر قانونی طور پر لوگ چھاپ رہے تھے۔

دارالمصنفین کے بعض ارکان کے وفات پا جانے کی وجہ سے ان کی خالی جگہوں کے لیے مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی اور مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی کا انتخاب عمل میں آیا ہے، اول الذکر کا وطن اعظم گڈھ ہے، یہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے محبوب شاگرد اور خاص مسترشد ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور ہندوستان کے دوسرے مدارس میں حدیث کا درس دینے کے بعد اب العین یونیورسٹی میں اس کے پروفیسر ہیں، اپنے خاص موضوع پر انھوں نے محققانہ کتابیں تالیف کی ہیں، ابتدا ہی سے دارالمصنفین سے ان کو بڑا گہرا تعلق رہا ہے اور اس کو فائدے بھی پہنچاتے رہے

ہیں۔ مولانا معصومی اسلامی علوم اور عربی زبان و ادب کے مشہور فاضل ہیں، پہلے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں استاذ پھر اس کے پرنسپل رہے، برہان اور معارف ان کے بلند پایہ علمی و تحقیقی مضامین سے متمتع ہوتے رہے ہیں، دار المصنفین اور علامہ شبلیؒ سے ان کو بڑا لگاؤ ہے، گذشتہ سال شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج میں علامہ شبلیؒ پر اپنا فاضلانہ خطبہ دینے کے لیے اعظم گڈھ تشریف لائے تو دار المصنفین میں قیام فرما کر اسے رونق بخشی۔

دار المصنفین کے جلسوں سے فراغت کے بعد راقم الحروف کو ۹ راگست کو مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی مجلس عاملہ اور ۱۰ راگست کو دار العلوم ندوۃ العلماء کے جلسہ انتظامیہ میں شرکت کی سعادت بھی میسر آئی، مجلس کے جلسہ میں اس کے سکریٹری مولانا سید محمد رابع ندوی نے ضابطہ کی کارروائی کے بعد اس کی کتابوں کی اشاعت و فروخت کے مسائل کی جانب توجہ دلائی جس پر ارکان نے ہمدردی اور دلسوزی سے غور کیا، دار العلوم کے جلسۂ انتظامیہ میں بھی ضابطہ کی ضروری کارروائی ہوئی اور اس کے گرامی مرتبت ناظم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے اپنی رپورٹ پیش کی جو اس اعتبار سے بڑی فکر انگیز تھی کہ اس میں ہندوستان اور دنیا کے مسلمانوں کو درپیش خطرات اور عالم اسلام کی بیخ کنی کے امریکی و اسرائیلی منصوبوں اور سازشوں کی جانب توجہ دلائی گئی تھی، دراصل اس وقت مسلمانوں کو جس چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اسی کے مقابلہ کے لیے ندوۃ العلماء کی تحریک وجود میں آئی تھی جس کی قیادت و رہنمائی خوش قسمتی سے مولانا جیسا بیدار مغز شخص کر رہا ہے، جنھوں نے گوناگوں حیثیتوں سے ندوہ کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے، وہی اس نازک موڑ پر ہندوستان میں سرمایہ ملت کی نگہبانی بھی کر سکتے ہیں۔

مقالات

سیرت نگاران نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

(بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں)

از

جناب شیخ نذیر حسین صاحب، لاہور

معاصر ترک فاضل استاذ فواد محمد سیزگین نے اپنی جلیل القدر تصنیف "تاریخ التراث العربی" کی جلد دوم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں (بعہد بنو امیہ اور بنو عباس) پر ایک علٰحدہ باب باندھا ہے، جس میں بعض نئی معلومات آگئی ہیں جن سے سیرت النبیؐ پر اردو کی عام کتابیں خالی ہیں، چنانچہ اس باب کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔ مطبوعہ کتابوں کے قلمی نسخوں کی تفصیل اور متعلقہ کتب خانوں کا بیان میں نے حذف کر دیا ہے۔ (نذیر حسین)

اموی عہد اسلام کے ابتدائی زمانے میں جب مسلمانوں میں تاریخ نویسی کا رواج ہوا تو سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوانح حیات کی جمع و ترتیب اور تدوین و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ متاخرین صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظام نے حیات مبارکہ پر بہت سی جامع اور مفصل کتابیں کتاب المغازی کے نام سے لکھیں۔ یہ کتابیں کتب السیرت بھی کہلاتی تھیں۔ امام الزہری (المتوفی ۱۲۴ھ) سب سے پہلے نامور محدث ہیں جنھوں نے لفظ سیرت کو اس کے اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا۔ قرن اول میں بہت سے مولفین نے سیرتِ مطہرہ پر قلم اٹھایا۔ کتب المغازی میں مندرجہ اقتباسات کے

حوالے سے ہم مندرجۂ ذیل مولفین/مرتبین کا ذکر کریں گے۔

۱۔ سعید بن سعد بن عُبادۃ الخزرجی

بشتر مورخین سعید بن سعد کو ان کے باپ کی طرح صحابی سمجھتے ہیں۔ ان کے والد زمانۂ جاہلیت میں تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے الکامل کہلاتے تھے۔ ہماری معلومات کے مطابق حضرت سعیدؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ حیات میں پیدا ہوئے، لیکن شرف ملاقات سے مشرف نہ ہو سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعید نے اوائل عمری سے آپؐ کی زندگی کے واقعات لکھنے شروع کر دیے تھے اور اپنے باپ کے طرز تحریر سے کچھ اختلاف بھی کیا تھا۔ ان کی کتاب اوائل عہد عباسی تک انکے پوتے سعید بن عمرو کے پاس محفوظ تھی (ابن حجر: التہذیب، ۴/۶۹) اس کتاب کے بعض حصے مسند احمد بن حنبل (۵/ ۲۲۲) اور مسند ابی عوانہ میں پائے جاتے ہیں (الاصابہ ۲/ ۱۲۲۳)۔ ابو عوانہ سعد بن سعید بن ابو عُبادہ کا اکثر حوالہ دیتے ہیں۔ تاریخ الطبری میں بھی بعض عبارتیں منقول ہیں (۱/۱۱- ۱۱۲) ہمیں حضرت سعیدؓ کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

حضرت سعید کے بیٹے شرجیل نے سو برس کی عمر میں ۱۲۳ھ/ ۷۴۰ء میں وفات پائی۔ وہ المغازی کے مولف تھے، انکے حالات کے ماخذ یہ ہیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۵/ ۸۰- ۸۱، مطبوعہ بیروت) (۲) ابن جبیر (المجبر ص ۴۲۲، ۴۳۱، ۴۳۲؛ (۳) ابن قتیبہ المعارف، ص ۱۳۲) (۴) ابن ابی حاتم، الجرح والتعدیل ۲/۱/۲۴- ۲۵)

۲۔ سہل بن ابی حثمہ

سہل بن ابی حثمہ، مدنی اور انصاری تھے۔ ان کا لقب ابو یحیٰی یا ابو محمد تھا۔ وہ ۳ھ/ ۶۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوائل شباب ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوانح حیات اور ان کی مغازی کی تدوین و تالیف میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کی مغازی کی بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پوتے یا پڑپوتے، محمد ابن یحیٰی بن سہل کے پاس ان کی مغازی کا نسخہ تھا۔ ان میں سے بعض ٹکڑے الواقدی کی المغازی میں ملتے ہیں (دیکھیے المغازی، ص ۹۵، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۰۷) الواقدی کے علاوہ یہ اقتباسات البلاذری (انساب الاشراف، ۱/ ۵۰۹) تاریخ الطبری ۱/ ۱۲۶۴، ۱۶۰۹، ۱۷۵۷، ۱۷۸۲-۱۷۹۳ اور طبقات ابن سعد ۱/ ۳۳۲، ۴۸۹، ۴۹۰، ۵۰۲ اور ۳/ ۲۱۲ مطبوعہ بیروت میں ملتے ہیں سہل بن ابی حثمہ نے حضرت امیر معاویہؓ کے عہد امارت میں ۴۱ھ/۶۲۱ء میں وفات پائی، ان سے ان کے بیٹے محمدؒ بھانجے محمد بن سلیمان، بشیر بن یسار الانصاری، نافع بن جبیر بن مطعم و عروہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ الزہری کو ان سے براہِ راست روایت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ حالات کے مصادر اور آثار علیہ ملاحظہ ہوں:

(۱) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۲/۱/۱- ۲۰۰؛ (۲) ابن حجر (الاصابہ ۲/ ۲۷۶؛ (۳) ابن حجر (التہذیب، ۴/ ۲۴۸- ۲۴۹) ان کی احادیث مسند احمد ۳/ ۴۴۸ و ۴/ ۲- ۳ میں ملتی ہیں۔

۳۔ سعید بن المسیب

ابو محمد سعید بن المسیب بن حزن المخزومی ۱۳ھ/ ۶۳۴ء میں پیدا ہوئے، وہ ماہر انساب، مورخ، محدث اور فقیہ تھے اور حضرت عمر فاروقؓ کی فقہ پر اعتماد کرتے

ہوئے فتاوی دیا کرتے تھے، اس لیے ان کو حضرت عمرؓ کا راوی کہا جاتا ہے۔ ان کے تلامذہ میں الزہری، قتادہ، حضرت عمرؓ کے پوتے محمد بن عبداللہ اور سالم وغیرہ شامل ہیں، حضرت سعید نے ۹۴ھ/۷۱۳ء میں وفات پائی، حالات کے ماخذ درج ذیل ہیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات ۵/۱۱۹-۱۴۳، مطبوعہ بیروت) (۲) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۲/۱/۵۹-۶۱) (۳) ابن حجر (التہذیب، ۴/۸۴-۸۸) (۴) الزرکلی (الاعلام، ۳/۱۵۵)

آثار علمیہ: الطبری نے حضرت سعید کی مغازی اور الفتوح اور سیرت نبوی ﷺ سے بہت استفادہ کیا ہے۔

۴۔ عبیداللہ بن کعب

ابو فضالہ عبیداللہ بن کعب بن مالک الانصاری متقدمین تابعین میں سے ہیں۔ ہمیں ان کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی۔ انھوں نے ۹۷ھ/۷۱۵ء میں انتقال کیا۔ وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں جبکہ خود ان سے امام زہری اور ان کے بھائی معبد وغیرہ حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ وہ اکابر علمائے انصار سے ہیں اور بعض نامور مولفین مغازی ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ تاریخ الطبری میں ان کے جو اقتباسات ملتے ہیں (۱/۱۳۶۴، ۱۴۶۳، ۱۴۷۹، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰) ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبیداللہ بن کعب کی کتاب المغازی زیادہ ضخیم نہ تھی۔ الطبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن اسحاق نے عبیداللہ بن کعب کی کتاب المغازی سے بھی استفادہ کیا تھا۔ حالات کے مصادر یہ ہیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۵/۲۰۱، مطبوعہ لائیڈن (۲) ابن ابی حاتم: الجرح

والتعدیل، ۴/۲/۳۳۱-۳۳۲؛ (۳) ابن حجر: التہذیب، ۷/۴۴-۴۵؛ (۴) ابن حجر: تقریب التہذیب، ۱/۵۳۸)

۵۔ الشعبی

ابو عمرو عامر بن شراحیل الشعبی ۱۹ھ/۶۴۰ء میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ عبدالملک بن مروان کے ہم نشینوں سے تھے، محدث، فقیہ، مغازی کے عالم اور شعر و سخن کے واقف کار اور راوی تھے۔ عبدالملک بن مروان نے انہیں سفیر بنا کر قیصر روم کے پاس بھیجا تھا اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے انہیں قاضی بھی مقرر کیا تھا۔ انھوں نے ۱۰۳ھ/۷۲۱ء میں وفات پائی۔ حالات کے ماخذ یہ ہیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۶/۱۷۱-۱۷۸، مطبوعہ بیروت (۲) ابن قتیبہ: المعارف، ص ۲۲۹ (۳) خطیب بغدادی: تاریخ بغداد، ۱۲/۲۲۷-۲۳۳ (۴) ابن خلکان: وفیات الاعیان ۱/۳۰۶-۳۰۷ (۵) الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ص ۷۹-۸۸ (۶) ابن حجر: التہذیب، ۵/۶۵-۶۶؛ (۷) الزرکلی: الاعلام، ۴/۱۸-۱۹ (۸) الکحالہ: معجم المولفین، ۵/۴۵)

مندرجۂ ذیل کتب حوالہ میں ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب المغازی (دیکھیے خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد، ۱۲/۲۳۰۔

(۲) الفرائض والجراحات (حوالہ سابق، ص ۲۳۲)

(۳) الکفایۃ فی العبادۃ والطاعۃ (کحالہ کی مذکورہ بالا کتاب)

(۴) الشعبی نے فتوح الاسلامیہ پر بھی کتاب لکھی تھی، اس کتاب کو امام قتیبہ بن مسلم نے اپنی یادداشت سے املا کرایا تھا۔ اس کی بعض عبارتیں تاریخ الطبری میں مذکور ہیں۔

۵۔ کتاب الشوریٰ و مقتل عثمانؓ۔

۶۔ اُبان بن عثمانؓ بن عفّان

جنگ جمل میں یہ حضرت عائشہؓ کے ہمراہ تھے (۳۶ھ/ ۶۵۶ء) جبکہ ان کی عمر صرف ۱۶ برس تھی۔ انھوں نے سیاسی معاملات میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ ۷۵ھ میں یہ مدینہ منورہ کے والی مقرر ہوئے (ابن سعد: الطبقات، ۵/ ۱۱۳) لیکن عبدالملک نے انہیں ۸۳ھ میں معزول کر دیا (الطبری، ۲/ ۱۱۴۱) ان کی وفات کی مختلف تاریخیں بیان کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ۹۶ھ/ ۱۰۶ھ کے کسی درمیانی سال میں فوت ہوئے۔ حضرت ابان بن عثمان کا شمار فقہائے مدینہ میں ہے (دیکھئے ابن حجر: التھذیب، ۱/ ۹۷) مغازی کی تمام قدیم کتابوں میں ان کی کتاب بھی قابل ذکر ہے (دیکھئے مقالہ یوسف ہارویز در اسلامک کلچر، حیدر آباد دکن ۱۹۲۷۔ ۱۹۲۸ء) مغازی کے کسی مورخ ماسوائے الیعقوبی (۱/ ۳) نے اس کا حوالہ نہیں دیا ہاں کتب حدیث میں انکی بہت سی روایات شامل ہیں۔

۷۔ عروہ بن الزبیر

عروہ بن الزبیر بن العوام الاسدی ۲۳ھ/ ۶۴۳ء اور ۲۹ھ/ ۶۴۹ء کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوئے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کے نواسے اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے بھائی تھے۔ شاید عمر میں تیس (۳۰) سال چھوٹے تھے۔ انھوں نے جنگ جمل میں شرکت نہیں کی اور سات سال (۵۸ھ تا ۶۵ھ) مصر میں گزارے۔ جب امویوں نے مکہ مکرمہ کا محاصرہ کیا تو وہ اپنے بھائی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ تھے لیکن انکی شکست کے بعد عبدالملک بن مروان کے پاس چلے گئے۔ ہشام بن عروہ بیان کرتے تھے کہ

ان کے باپ نے اپنی بہت سی فقہ کی کتابیں یوم الحرّة (۶۳ھ) میں جلا دی تھیں، جنکا ان کو عمر بھر افسوس رہا (دیکھئے طبقات ابن سعد، ۵/ ۱۳۳) حضرت عروہ کا شمار مدینہ کے سات ممتاز فقہاء میں ہے، انھوں نے ۹۴ھ میں وفات پائی، وہ محدث بھی تھے اور اپنے تلامذہ سے احادیث اور صدر اسلام کے بہت سے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔ ابن اسحاق، الواقدی اور الطبری ان کی کتابوں کے حوالے دیتے ہیں وہ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدیم ترین مصنف بھی ہیں اور سیرت النبیؐ کے متعلق لوگوں کے سوالات کا جواب اپنی جمع کردہ احادیث سے دیا کرتے تھے۔ امام سخاوی نے الاعلان میں لکھا ہے (ص ۸۸) کہ امام زہری اور ابو الاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل مغازی کے واقعات عروہ بن الزبیر کی زبانی بیان کیا کرتے تھے (دیکھئے ابن حجر: التھذیب، ۹/ ۳۰۷۔ ۳۰۸) اور الاصابہ، ۱/ ۲۵۵) حالات کے مصادر درج ذیل ہیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۵/ ۱۳۲) (۲) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۱۱۴ (۳) امام بخاری (تاریخ الکبیر، ۴/ ۱/ ۳۱۔ ۳۲ (۴) ابو نعیم حلیۃ الاولیاء، ۲/ ۱۷۶۔ ۱۸۲) (۵) ابن خلکان (وفیات الاعیان: ۱/ ۳۹۸۔۔۔ ۴۰۰، مطبوعہ بولاق) (۶) ابن حجر: (التھذیب، ۷/ ۱۸۰۔ ۱۸۵) (۷) مقدمہ زخاؤ، در طبقات ابن سعد) (۸) الزرکلی: الاعلام، ۵/ ۱۷) (۹) ولہاوزن اور یوسف ہارویز کے مقالات' در اسلامک کلچر حیدر آباد دکن۔

آثار علمیہ:۔ یوسف ہارویز اور عبدالعزیز الدّوری نے مندرجہ بالا مقالات میں عروہ بن الزبیر کی مغازی کی بعض عبارتیں جمع کر دی ہیں۔ امام مسلم نے عروہ بن الزبیر کی احادیث کے رجال پر ایک رسالہ لکھا تھا، جس کے پچپن (۵۵) اوراق خطیب بغدادی

کے لکھے ہوئے کتاب خانہ الظاہریہ دمشق میں ہیں۔ ان کے مکاتیب بنام عبدالملک بن مروان کے لیے دیکھئے تاریخ الطبری ۱/۱/۱۱۸۱- ۱۲۸۴- ۱۲۸۸) ان مکاتیب کو سپرنگر نے جرمن زبان میں ترجمہ کر دیا ہے۔

۸۔ شرحبیل بن سعید

سیرت و مغازی کے قدیم مصنفین سے ہیں۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب سے متعارف تھے (ابن حجر، التہذیب، ۴/ ۳۲۲) کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سو (۱۰۰) برس کی عمر پا کر ۱۲۳ھ میں وفات پائی۔ موسیٰ بن عقبہ (المتوفی ۱۴۱ھ/ ۷۵۸ء) کا بیان ہے کہ حضرت شرحبیل نے غزوۂ بدر میں شریک ہونے والے مہاجرین کی ایک فہرست بھی تیار کی تھی۔ سفیان بن عیینہ نے ان کو مغازی کے جلیل القدر عالموں میں شمار کیا ہے (ابن حجر، التہذیب، ۴/ ۳۲۱) اگرچہ ابن اسحاق اور واقدی نے ان سے کوئی روایت نہیں کی، لیکن ابن سعد نے طبقات، ۱/۱/ ۱۶۰، مطبوعہ لائیڈن میں ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان سے ایک روایت درج کی ہے (دیکھئے یوسف ہارویز کا مقالہ در اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن، ۱۹۲۷ء) حالات کے مصادر کے لیے دیکھیں:

(۱) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۲/۱/ ۳۳۸ - ۳۳۹) (۲) یاقوت (معجم البلدان، ۱/ ۲۶۹) (۳) عبدالعزیز الدوری (علم التاریخ عند العرب، ص ۲۲)

۹۔ القاسم بن محمد

ابو محمد، القاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق، ۳۷ھ/ ۶۵۷ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ وہ عروہ کی طرح اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے۔ الشعبی اور الزہری انکے راویوں سے ہیں۔ آخر عمر میں ان کی بصارت جاتی رہی تھی۔ انھوں نے ۱۰۷ھ/ ۷۲۵ء

میں انتقال کیا۔ حالات کے مآخذ کے لیے ملاحظہ ہو:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۵/ ۱۸۷ - ۱۹۴، مطبوعہ بیروت) (۲) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۳/۲/ ۱۱۸) (۳) ابونعیم (حلیۃ الاولیاء، ۲/ ۱۸۲) (۴) العنبری (نکت الہمیان، ص ۲۲۰) (۵) (۶) ابن حجر (التہذیب، ۸/ ۳۲۳ - ۳۳۵) (۷) ابن حجر (تقریب التہذیب، ۲/ ۲۲۱) (۸) الزرکلی (الاعلام، ۶/ ۱۵)

تصانیف:۔ (۱) الطبری نے قاسم بن محمد کی کتاب سے بہت سی عبارتیں اپنی تاریخ میں دی ہیں، دیکھئے تاریخ الطبری ۱/ ۱۵۱، ۱۵۳، ۱۷۴، ۳۵۰ - ۵۲۸ - اس کے علاوہ فہرست تاریخ الطبری میں پچیس (۲۵) بار قاسم بن محمد کی کتاب المغازی کا حوالہ آیا ہے، ان میں حضرت ابوبکر الصدیقؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ کے عہد خلافت کے واقعات کے علاوہ جنگ جمل کا بھی ذکر ہے۔ یہ واقعات سہل بن یوسف السلمی کے واسطے سے قاسم بن محمد کی مغازی سے ماخوذ ہیں۔ بعض عبارتیں الواقدی اور البلاذری نے بھی نقل کی ہیں۔

۱۰۔ عاصم

عاصم بن عمر بن قتادۃ المدنی ابو عمر، تابعی ہیں۔ انھوں نے بعض صحابہ مثلاً جابر بن عبداللہ اور حضرت انس بن مالک سے روایت کی ہے جبکہ ان سے ان کے بیٹے الفضل، زید بن اسلم، ابوالاسود (عروہ کے پروردہ) اور محمد بن قاسم وغیرہ نے روایتیں کی ہیں۔ مغازی کے مشہور عالم تھے۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے انھیں حکم دیا تھا کہ وہ جامعِ دمشق میں لوگوں کو مغازی اور مناقبِ صحابہ کا درس دیا کریں۔ حضرت عاصم نے ۱۲۰ھ/ ۷۳۷ء میں وفات پائی۔ حالات کے مآخذ کے لیے دیکھئے۔

(۱) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۳۶) (۲) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۳/۳۳۶) (۳) القیسرانی (الرجال، ص ۳۸۳) (۴) ابن حجر (التہذیب، ۵/۵۳-۵۴) (۵) وہی مصنف (الاصابہ، ۳/۴۴۳) (۶) مقالہ یوسف ہارویز، در مجلہ اسلامک کلچر، حیدرآباد دکن، شمارہ ۲، ۱۹۲۸ء)

آثار علمیہ :- ابن اسحاق اور واقدی نے محمد بن صالح محمد بن دینار کے واسطے سے عاصم کی اکثر روایتیں نقل کی ہیں جبکہ ابن سعد نے یہ روایتیں واقدی سے لی ہیں۔ (الطبری کے اقتباسات کے لیے دیکھئے فہارس تاریخ الطبری، ص ۳۰۳)

۱۱- امام الزہری

ابوبکر محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب الزہری۔ ۵۰ھ/۶۷۰ء یا ۵۱ یا ۵۶-۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی سنہ میلاد کی تاریخیں مختلف ہیں۔ امام زہری محدث، مورخ اور شعر و سخن کے شناسا تھے۔ محدث کے طور پر ان کے دو علمی کارنامے ہیں۔

وہ سب سے پہلے محدث ہیں جنھوں نے احادیث میں اسناد کا التزام کیا۔ (دیکھئے مقدمہ ابن ابی حاتم، ص ۲۰) اس کے علاوہ انھوں نے احادیث کو مدون کیا (ابن عبدالبر، جامع بیان العلم، ۱/۷۳)، اس لیے تاریخ الحدیث میں ان کا اہم مقام ہے۔ ان کے زمانے سے پہلے حدیث کا ذخیرہ یا تو اسناد سے خالی تھا یا زبانی روایات پر مشتمل تھا اور سارے عالم اسلام میں منتشر تھا۔ امام زہری کے زمانے میں صحابۂ کرام جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تھا اور اوائل تابعین کی روایت کردہ بہت سی احادیث زبانی یا منتشر تحریروں میں موجود تھیں انھوں نے رواۃ کے ناموں

سمیت مدون کیا (دیکھئے راقم السطور کی کتاب مآخذ بخاری، ص ۲۰) اس کے علاوہ ایک اور اہم کارنامہ امام زہری نے سرانجام دیا۔ ان کے پاس بہت سے راویان یا مولفین حدیث اپنے کراسے یا نوشتے لے کر حاضر ہوتے کہ امام صاحب ان میں رواۃ کے نام لکھ دیں، لیکن مشاغل کے ہجوم میں ہر شخص کے مطالبے کو پورا کرنا مشکل تھا۔ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ انھوں نے اپنے تمام تلامذہ کو مشورہ دے دیا کہ وہ حدیث کو کسی شیخ سے سماع اور قرأت کے بغیر بے تکلف روایت کرتے جائیں۔ اصول حدیث کی کتابوں میں اس طریقے کو الاجازہ والکتابہ کہا جاتا ہے (خطیب بغدادی، الکفایہ فی علم الروایہ، ص ۳۱۸) گولٹ تسیہر کا یہ کہنا کہ امام زہری نے بنو امیہ کی سلطنت کے استحکام کے لیے یہ طریقہ نکالا، محض کم نظری اور غلط فہمی کی دلیل ہے [حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ ہشام نے امام زہری سے فرمایش کی تھی کہ وہ اس کے بیٹے کے لیے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کر دیں]

مندرجۂ بالا واقعہ کے ساتھ امام زہری کے اس قول کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا کہ ہم علم کو کتابت کی قید میں لانا ناپسند کرتے تھے، یہاں تک کہ امراء نے ہمیں کتابت پر مجبور کیا۔ میری رائے میں اس کا صحیح مفہوم یہ ہے، "احادیث کو کسی شیخ سے سماع یا قرأت کے بغیر لکھ لیا جائے تو یہ طریقہ ہمیں منظور نہ تھا، لیکن افادۂ عام کی غرض سے ہمیں امراء نے سماع یا قرأت کے بغیر کتابت پر مجبور کر دیا" (دیکھئے السیوطی: تقریب الراوی، ص ۱۴۶)

امام زہری کا دوسرا اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے احادیث کو مدون کیا۔ گو امام زہری کے زمانے سے بہت پہلے حدیث کی تدوین کا آغاز ہو گیا تھا لیکن یہ تحریری

سرمایہ کراسوں کی شکل میں پایا جاتا تھا، انھوں نے ان تمام تحریروں کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ امام زہری کے پیش رو ابوبکر بن حزم نے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی فرمایش پر احادیث لکھ کر بھیجیں۔ امام زہری کے تلمیذ معمر کا بیان ہے کہ امویوں کے شاہی کتاب خانے میں امام زہری کی کتابیں کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھیں۔ الطبری نے لکھا ہے کہ الزہری مورخ، علم المغازی اور "اخبار قریش والانصار" کے اولین مصنف تھے۔ اس کے علاوہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرام کے سوانح نگار بھی تھے (دیکھئے ذیل المذیل، ص ۹۷؛ عبدالعزیز الدوری (علم التاریخ، ص ۸۱) علاوہ ازیں وہ لفظ سیرت کے اصطلاحی مفہوم سے بھی شناسا تھے۔ حالات کے مآخذ درج ذیل ہیں:

(۱) البخاری (تاریخ الکبیر ۱/۱/ ۲۲۱)؛ وہی مصنف: تاریخ الصغیر، ص ۹۳، ۱۰۴، ۸۴۴ مطبوعہ الٰہ آباد؛ (۲) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۳۹) (۳) المرزبانی (معجم الشعراء ص ۴۱۳) (۴) ابونعیم (حلیۃ الاولیاء ۳/ ۳۶۰ - ۳۶۱) (۵) ابن اثیر (الکامل، ۷/ ۲۸۹) (۶) ابن کثیر (البدایۃ والنہایۃ، ۹/ ۳۴۰ - ۳۴۸) (۷) الذہبی (تاریخ الاسلام ۵/ ۳۴۰ - ۳۴۸) (۸) عبدالعزیز الدوری (علم التاریخ، ۲۰ - ۳۲) (۹) الزرکلی (الاعلام ۷/ ۳۱۷) (۱۰) زخاؤ کا تحقیقی مقدمہ بر طبقات ابن سعد، ج ۳/ ۱، ج ۱۳، ج ۱۹۔ مذکورہ کتب کے علاوہ زخاؤ، گولڈ تسیہر، یوسف ہارویز اور عبدالعزیز الدوری نے اسی موضوع پر مقالات لکھے ہیں۔

آثار علمیہ: ۱۔ المغازی: حاجی خلیفہ نے (کشف الظنون، ص ۱۷۴۷، مطبوعہ استانبول) میں لکھا ہے اور السخاوی کا یہ بھی قول ہے کہ امام زہری عروہ بن الزبیر کی مغازی کے راوی ہیں (اعلان بالتوبیخ، ص ۸۸) معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے

اس کتاب سے استفادہ موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے کیا ہے (دیکھئے صحیح البخاری، ۵/ ۸۶؛ علم التاریخ از عبدالعزیز الدوری، ص ۹۷) السخاوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ کتاب المغازی کے راوی الحجاج بن ابی منیع (المتوفی ۲۱۶ھ/ ۸۳۱ء) ہیں، ملاحظہ ہو (ابن سعد۔ طبقات ۷/ ۱۷۵، مطبوعہ بیروت؛ امام بخاری (تاریخ الکبیر ۱/ ۲/ ۳۸۰) اس مغازی کے بعض اقتباسات تک ہماری رسائی عبدالعزیز الدوری کی سعی و کاوش کی مرہون منت ہے۔ اس کا مخطوطہ کتب خانہ الظاہریہ دمشق میں ہے۔

۲۔ نسب قریش: معلوم ہوتا ہے کہ مصعب الزبیری نے اپنی کتاب "نسب قریش" کا مدار امام زہری کی کتاب نسب قریش پر رکھا ہے (دیکھئے الزبیری کی نسب قریش، ص ۳، امام زہری کی کتاب سے اقتباسات (ابن حزم، الجمہرہ، ص ۵ اور ابن حجر، الاصابہ، ۱/ ۱۰۲۱) میں بھی پائے جاتے ہیں۔

۳۔ اسنان الخلفاء: خلفائے اسلام کے سنہ وار حالات۔ تاریخ الطبری میں اس کے دو ٹکڑے ہیں (۲/ ۴۲۸)۔

۴۔ الناسخ والمنسوخ فی القرآن: اس کی تہذیب و ترتیب الحسین بن محمد اللّمی (المتوفی ۴۱۲ھ/ ۱۰۲۱ء) نے کی تھی، مخطوطہ کتب خانہ بایزید (استانبول) میں ہے۔

۵۔ احادیث: ابو محمد الحسن بن علی بن محمد بن الحسن الجوہری (المتوفی ۴۵۴ھ/ ۱۰۶۲ء) کا روایت کردہ قلمی نسخہ جرمنی میں ہے۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں اس کے بہت سے اقتباسات دیے ہیں۔

۶۔ تنزیل القرآن، صلاح الدین المنجد کی تحقیق اور تعلیق سے بیروت سے ۱۹۶۳ء میں شایع ہوا تھا۔

۷۔ مشاہد النبی ۔ اس کے راوی یونس بن یزید الایلی (المتوفی ۱۵۹ھ/۷۷۰ء) ہیں۔ (امام بخاری: تاریخ الکبیر، ۴/۲/۴۰۶) الطبری نے اپنی تاریخ میں اس کے چند اقتباسات بھی دیے ہیں۔

۸۔ امام زہری کے چار اشعار خلیفہ عبدالملک بن مروان کی تعریض میں ملتے ہیں۔ (المرزبانی: معجم الشعراء، ص ۳۱۳)

۱۰۔۱۲ السبیعی

ابواسحاق عمرو بن عبداللہ السبیعی الہمدانی ۳۲ھ/۶۵۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷ھ/۷۴۵ء میں فوت ہوئے، عمر بھر کوفہ میں رہے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۳۸ صحابیوں سے حدیث کا سماع کیا تھا۔ مغازی کے بڑے عالم تھے (دیکھئے فتوح مصر از واقدی) حالات کے ماخذ کے لیے دیکھیں:

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۶/۱۲۳، ص ۱۷۸، مطبوعہ بیروت) (۲) ابن قتیبہ: (المعارف، ص ۲۲۹) (۳) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۳/۳۴۳، ۲، (۴) الذہبی (تذکرۃ الحفاظ، ص ۱۱۴ - ۱۱۶) (۵) ابن حجر (التہذیب، ۸/۶۳-۶۷) (۶) وہی مصنف: تقریب التہذیب، ۲/۷۳؛ (۷) الزرکلی، الاعلام، ۵/۲۵۱)

آثار علمیہ: تاریخ الطبری میں مندرجہ بعض قطعات سے پتہ چلتا ہے کہ الطبری نے السبیعی کی کتب مغازی اور فتوحات سے براہ راست استفادہ کیا ہے اور واقدی نے بھی ان کی بہت سی عبارتیں دی ہیں (دیکھئے ابن قتیبہ: المعارف، ص ۹۱، ۱۰۶)

۱۳۔ یعقوب بن عتبہ

یعقوب بن عتبہ بن المغیرہ الثقفی المدنی امام زہری کے معاصر تھے۔ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقف کار تھے۔ انھوں نے ۱۲۸ھ/۷۴۵ء میں وفات پائی۔ حالات کے مصادر درج ذیل ہیں:

(۱) ابن حجر (التہذیب' ۱۱/ ۳۹۲) (۲) الذہبی: تراجم رجال جن سے محمد بن اسحاق نے روایت کی، ص ۸۷ - ۸۸، تحقیق فیشر)

علمی آثار: تاریخ الطبری میں یعقوب بن عتبہ کی السیرۃ کے بہت سے اقتباسات ہیں (فہارس تاریخ الطبری، ص ۶۴۶) معلوم ہوتا ہے کہ الطبری نے یہ اقتباسات یعقوب کے حوالے سے ابن اسحٰق سے نقل کیے ہیں۔ ان کے حوالے سے دو مزید ٹکڑے کتاب الواقدی سے ماخوذ ہیں (الطبری ۱/ ۲۵۲۹-۲۸۹۴)

۱۴۔ عبداللہ بن ابی بکر

عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم المدنی ۵۶ھ یا ۶۰ھ/ ۶۷۹ء میں مدینہ میں پیدا ہوئے، وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، جو مورخ، فقیہ اور محدث تھے۔ ان سے حضرت امام مالک، ابن جریج اور ہشام بن عروہ وغیرہ حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ عبداللہ بھی اپنے باپ کی طرح مورخ اور محدث تھے، لیکن انکی زندگی میں زیادہ شہرت نہ حاصل کر سکے۔ ابن اسحاق، الواقدی، ابن سعد اور الطبری وغیرہ سے پتہ چلتا ہے کہ عبداللہ کتاب المغازی کے مولف تھے معلوم ہوتا ہے کہ انکے بھانجے عبدالملک بن محمد القاضی (المتوفی ۱۷۶ھ/۷۹۲ء) ان کے راوی تھے۔ شاید عبدالملک نے بھی کتاب المغازی تالیف کی تھی (ابن الندیم: الفہرست، ص ۲۲۶) عبداللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض مکاتیب کی بھی روایت کرتے تھے جو آپؐ نے اپنے معاصرین کو بھجوائے تھے۔ ان میں ایک مکتوب گرامی

فرماں روایانِ حمیر کے نام بھی تھا (الطبری، ۱/ ۱۷۱۷۔۱۷۲۰)۔ عبد اللہ نے ۱۳۰ھ/ ۷۴۷ء یا ۱۳۵ھ میں انتقال کیا۔ حالات کے مآخذ یہ ہیں۔

(۱) ابن سعد (الطبقات، ۷/ ۶۸، مطبوعہ بیروت) (۲) البخاری (تاریخ الکبیر ۳/ ۱/ ۵۴) (۳) ابن حجر (التہذیب، ۵/ ۱۶۴۔ ۱۶۵)

۱۵۔ یزید بن رومانؒ

یزید بن رومان الاسدی المدنی، ابو روح، آل الزبیر بن العوام کے موالی سے تھے۔ ان کا شمار متاخر تابعین میں سے ہے، اگرچہ انھوں نے صحابۂ کرام سے روایت نہیں کی۔ وہ محدث اور مغازی کے مولف تھے۔ ان کی روایات کا مدار عروہ اور الزہری کے اقوال ہیں لیکن خود ان سے محمد بن اسحاق اور حضرت مالک بن انس اور ہشام بن عروہ وغیرہم روایت کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یزید بن رومان کی کتاب المغازی محمد بن صالح بن دینار (المتوفی ۱۶۸ھ/ ۷۸۴ء) کی روایت سے الواقدی کی دسترس میں تھی (ابن حجر (التہذیب، ۹/ ۲۲۵۔ ۲۲۶) طبقات ابن سعد میں بھی اسکے اقتباسات ملتے ہیں۔ انھوں نے ۱۳۰ھ/ ۷۴۷ء میں وفات پائی۔ حالات کے مصادر درج ذیل ہیں۔

(۱) القیسرانی (الرجال، ص ۵۰۳) (۲) ابن الجزری (غایۃ النہایۃ ۲/ ۳۸۱) (۳) الذہبی (تاریخ الاسلام، ۵/ ۱۸) (۴) ابن حجر (التہذیب، ۱۱/ ۳۲۵) (۵) الزرکلی (الاعلام، ۹/ ۲۳۴)

علمی آثار: الطبری نے ابن سعد، الواقدی اور ابن اسحاق کے حوالے سے یزید بن رومان کی المغازی کی بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں (فہارس تاریخ الطبری، ص ۶۴۱)

۱۶۔ ابو الاسود

ابو الاسود محمد بن عبد الرحمٰن بن نوفل بن الاسود الاسدی نے عروہ بن الزبیر کے دامن شفقت میں تربیت پائی تھی۔ وہ تابعی ہیں اور عروہ بن الزبیر ان کے سب سے بڑے شیخ (استاد حدیث) ہیں۔ خود ان سے الزہری، عبید اللہ بن ابی جعفر (مورخ مصر) عبد اللہ بن لہیعہ، شعبہ اور اللیث وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں، اہل علم کے نزدیک ابو الاسود کی روایات قابل وثوق ہیں۔ ابن حجر نے الاصابہ میں انکی کتاب المغازی کے جو مقطوعات دیے ہیں، ان سے ابو الاسود کی باریک بینی اور دقیقہ رسی کا پتہ چلتا ہے اگرچہ ان کا منبع و مآخذ عروہ بن الزبیر کے اقوال ہیں۔ حالات کے مصادر درج ذیل ہیں۔

(۱) ابن ابی حاتم، مقدمہ، ص ۱۲۰، (۲) ابن حجر (التہذیب، ۹/ ۳۰۷۔ ۳۰۸)

تالیفات: ابو الاسود کی کتاب المغازی سے منتخبات البلاذری کی کتاب انساب الاشراف، ۱/ ۱۱۲۔ ۳۵۱، الطبری، ابن حجر کی الاصابہ (بے شمار مقامات) اور ابن سعد (الطبقات، ۱/ ۲۱۳، ۲۱۵، ۳/ ۱۳۶، ۱۶۴، مطبوعہ بیروت) میں ہیں۔

۱۷۔ داؤد بن الحصین

ابو سلیمان داؤد بن الحصین الاموی، عکرمہ اور نافع وغیرہم کے شاگرد اور امام مالکؒ اور ابن اسحاق کے شیخ تھے۔ اپنے استاد عکرمہ کی طرح خوارج کی طرف مائل تھے۔ بعض محدثین نے ان کی روایات کی تضعیف کی ہے اور بعض نے ان کی توثیق کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرام کے حالات جمع کرنے کا ہی اہتمام کیا تھا۔ انھوں نے ۱۳۵ھ/ ۷۵۲ء میں رحلت کی، حالات کے مآخذ کے لیے ملاحظہ ہو:

(۱) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۳۴) (۲) ابن ابی حاتم (علل الحدیث، ۱/ ۳۸۰) (۳) القیسرانی (الرجال ۱/ ۱۲۹) (۴) ابن حجر (التہذیب، ۳/ ۱۸۱۔ ۱۸۲)

آثار علمیہ: عبداللہ بن محمد بن عمارۃ الانصاری (المتوفی ۲۰۰ھ/۸۱۵ء) نے ابوسلیمان کی کتاب جو ان کی خود نوشتہ تھی سے استفادہ کیا تھا (دیکھئے طبقات ابن سعد، ۳/۲۴۹؛ مطبوعہ بیروت)، مزید براں الواقدی، ابن سعد اور البلاذری وغیرہم نے داؤد بن الحصین کی مغازی سے بہت سے مندرجات نقل کیے ہیں۔

۱۸۔ ابوالمعتمر

ابوالمعتمر سلیمان بن طرخان التیمی، ۴۶ھ/۶۶۶ء میں پیدا ہوئے، حضرت انس بن مالک کے علاوہ بہت سے قدیم تابعین، مثل الحسن البصری وغیرہم سے حدیث کی روایت کی۔ ان کی دقیقہ رسی کی وجہ سے اہل علم ان کی تعریف و توصیف کرتے ہیں، انہوں نے ۱۴۳ھ/۷۶۰ء میں بصرہ میں انتقال کیا۔ حالات کے مآخذ یہ ہیں:
(۱) ابن سعد (الطبقات، ۷/۲۵۲-۲۵۳، مطبوعہ بیروت)، البخاری (تاریخ الکبیر، ۲/۱/۲۲-۲۳) (۲) ابن قتیبہ (المعارف، ص ۲۴۰) (۳) ابن ابی حاتم: (الجرح والتعدیل، ۲/۱/۱۲۴-۱۲۵) (۴) ابن حجر (التہذیب، ۴/۲۰۱-۲۰۲) (۵) السخاوی (الاعلان بالتوبیخ، ص ۸۸)

تصانیف: کتاب المغازی۔ خطیب بغدادی نے دمشق میں ان کی روایت کی اجازت حاصل کی تھی (مشیختہ للخطیب بغدادی، در کتاب خانہ الظاہریہ، دمشق) تاریخ الطبری میں اس کے دو بڑے اقتباسات ہیں، ۱/۲۹۶۳، ۲۹۴۵ وغیرہ، امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب المغازی میں خصوصاً جلد پنجم میں اس کی عبارتیں نقل کی ہیں۔

۱۹۔ موسیٰ بن عقبہ

ابو محمد موسیٰ بن عقبہ کی تاریخ پیدائش کا ہمیں علم نہیں۔ طبقات سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ نوجوان ہی تھے جبکہ انہوں نے ۶۸ھ/۶۸۷ء میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا اور وہ حج کرنے مکہ معظمہ جا رہے تھے (ابن حجر (التہذیب، ۱۰/۳۶۲، تاریخ الطبری، ۲/۴۸۲) ہمارے اندازے کے مطابق ان کی زیادہ سے زیادہ تاریخ پیدائش ۵۵ھ متعین ہو سکتی ہے۔ موسیٰ بن عقبہ امام زہری کے شاگرد رشید تھے۔ مسجد نبویؐ میں ان کا حلقہ درس تھا جہاں وہ روایات کا اجازہ عطا فرمایا کرتے تھے۔ مورخ کی حیثیت سے ان کی تمام تر توجہ کا مرکز مغازی رسولؐ اور خلفائے راشدین تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مہاجرین حبشہ اور بیعت عقبہ میں شامل ہونے والوں کے اسمائے گرامی بھی ضبط کیے تھے۔ انہوں نے چند مواقع پر امویوں کا بھی ذکر کیا ہے (دیکھئے طبقات ابن سعد، ۵/۲۸۳) موسیٰ بن عقبہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سنہ وار تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہیں، ان کے بہت سے پیش رو جن میں عبداللہ بن ابی بکر بن حزم (المتوفی ۱۲۰ھ/۷۳۷ء) بھی شامل ہیں، سنین کا التزام کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنی تاریخ میں اشعار سے شاذ و نادر استشہاد کرتے ہیں۔ انہوں نے ۱۴۱ھ میں انتقال کیا۔ حالات کے مآخذ درج ذیل ہیں
(۱) ابن ابی حاتم (الجرح والتعدیل، ۴/۲/۱۵۵) (۲) الذہبی (طبقات الحفاظ، ص ۱۴۸)، (۳) عبدالعزیز الدوری (علم التاریخ، ص ۲۷) (۴) الزرکلی الاعلام، ۸/۲۷۶)، (۵) الکحالہ (معجم المولفین، ۱۳/۴۳)

تالیفات: امام مالک نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی پر سخت جرح کی ہے۔ (ابن حجر: التہذیب، ۱۰/۳۶۰) ان کی مغازی کی بنیاد امام زہری کی کتاب المغازی

کی روایات پر ہے، جن کو وہ مختلف الفاظ سے روایت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ موسیٰ نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے تحریری ذخیرہ سے بھی استفادہ کیا تھا جو کریب مولیٰ ابن عباس نے موسیٰ بن عقبہ کی امانت میں دے دیا تھا اور یہ کتابی ذخیرہ کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھا (طبقات ابن سعد، ۵/۲۱۶) موسیٰ بن عقبہ کی اصل کتاب تو ضایع ہو چکی ہے، اس کا ایک ٹکڑا برلن میں تھا، جس کا جرمن ترجمہ زخاؤ نے شایع کیا ہے۔ یوسف بن عبد اللہ بن عبد البر المتوفی ۴۶۳ھ/۱۰۷۱ء) نے اس کا اختصار کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر کے نام سے کیا تھا (جو چھپ گیا ہے) حافظ ابن حجر نے کتاب المغازی سے بے شمار اقتباسات الاصابہ میں دیے ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی کا ایک ٹکڑا جناب مصطفیٰ الاعظمی نے بیروت سے شایع کیا ہے۔ (باقی)

حضرت شیخ احمد کھتوی سرکھیجی

از مولانا محمد یوسف متالا، لندن

شیخ احمد کھتوی شیخ اسحاق مغربی کے خلیفہ تھے جو حضرت شیخ ابو مدین مغربی کے فیض یافتہ تھے، صاحب تحفۃ المجالس کا بیان ہے کہ حضرت شیخ اسحاق مغربی اپنے پیر شیخ ابو مدین مغربی کی وفات کے بعد ان کے اشارے سے ہندوستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ سلطان فیروز شاہ کے زمانہ میں اجمیر آئے اور حضرت خواجہ اجمیری کے مزار پُر انوار پر ایک عرصہ تک قیام فرمایا۔ ایک رات حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے خواب میں ارشاد فرمایا کہ ناگور کے علاقہ میں قصبہ کھتو یا کھاتو میں جاکر کام کریں۔

خطہ پاک اوچ نامی کتاب میں ہے کہ وہ شیخ معین الدین اجمیری کے معاصر ہیں۔ ان کو حضرت اجمیریؒ نے کھتو یا کھاتو بھیجا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منامی ارشاد نہیں بلکہ بیداری کا واقعہ ہے، بہر حال وہ کھتو یا کھاتو میں فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے اور خلق خدا کو روحانیت سے مالا مال کرتے رہے۔ ایک وقت آیا کہ سلطان فیروز شاہ بھی نیاز مندانہ خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ کو دیکھ کر مخلوق کا رجوع ان کی جانب اور زیادہ بڑھ گیا ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء / ۷۶۳ھ/۱۳۶۱ء میں وفات پائی۔

شیخ اسحاق پیر روشن دل — آنکہ در خلق ذات او طاق است
رکن رقم سال رحلتش سرود — آنکہ مشہور جملہ آفاق است

مہدی متقی امین اللہ نیز سردار عالم اسحاق است
۷۷۶ھ ۷۷۶ھ ۷۷۶ھ

شیخ کھتو کا نام احمد بن عبداللہ اور لقب گنج بخش تھا، جمال الدین، شہاب الدین اور گنج گیسر بھی لقب تھا۔ جہانگیر اپنی توزک میں گجرات کے سفر کے سلسلے میں کھتو کے بارے میں لکھتے ہیں:

"چونکہ شیخ احمد کھٹو کا مزار سرراہ پر واقع تھا اس لیے وہاں فاتحہ پڑھنے گیا'
کھٹو سرکار ناگور میں واقع ایک قصبہ کا نام ہے شیخ کی ولادت یہیں ہوئی تھی۔"

لیکن دراصل شیخ کے مولد کے بارے میں جہانگیر کو سہو ہوا ہے۔ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی جیسا کہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں تحریر کیا ہے۔ وہ ۷۳۷ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، اور وہاں کے بزرگوں میں تھے۔ بابا اسحاق مغربی کے مرید و خلیفہ تھے، ان کا نام نصیر الدین تھا۔ بحر الثواریخ میں بھی ۷۳۷ھ میں دہلی میں متولد ہونے کی صراحت موجود ہے۔ مگر حکمت الٰہی نے انہیں کھتو پہنچا دیا اور کھتوی سرکھیجی کی نسبتوں سے مشہور ہوئے۔

جودھ پور کے ضلع ناگور میں کھاٹو نام کے دو موضع ہیں جو ایک دوسرے سے دو تین میل کے فاصلے پر ہیں۔ دونوں میں امتیاز کرنے کی خاطر مشرقی قصبے کو چھوٹی کھاٹو اور مغربی کو بڑی کھاٹو کہتے ہیں، کھاٹو جدید تلفظ ہے۔ قدیم صورت کھٹو ہے۔ تمام پرانی کتابوں، فرامین اور کتبوں میں یہ نام بہ صورت "کھٹو" ملتا ہے۔ بڑی کھاٹو کسی زمانے میں نہایت اہم جگہ رہی ہے، جہاں بہت سی مساجد، مزارات اور دوسرے پرانے آثار موجود ہیں۔ ان میں سب سے قدیم سلطان شمس الدین التمش (متوفی ۶۳۳ھ) کے دور کی ایک مسجد ہے۔ اسی عہد کا ایک کتبہ بھی موجود ہے۔ سنگ مرمر کے اس

کتبے پر جو عربی میں کندہ ہے، رمضان ۶۲۹ھ تاریخ دی گئی ہے۔ کتبے کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدا میں التمش کے عہد میں کسی تالاب پر نصب کیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ اس علاقے میں پانی کی قلت کے سبب سے برسات کا پانی بڑے بڑے تالابوں میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ جو سال بھر استعمال ہوتا ہے۔ آج کل یہ کتبہ حضرت اسحاق مغربی (متوفی ۷۶۳ھ) کی درگاہ میں موجود ہے۔ جو شیخ احمد کھٹو کے پیر و مرشد تھے اور جن کا مزار سرکھیج (گجرات) میں واقع ہے۔

افسوس ہے کہ شیخ کے حالات بہت کم ملتے ہیں، سب سے قدیم کتاب مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول ہے جو نویں صدی ہجری کے وسط کی تالیف ہے۔ یہ انکے کسی معتقد محمد قاسم نامی کی تصنیف ہے۔ اس کا قلمی نسخہ احمد آباد میں حسینی پیر کے کتب خانے میں موجود ہے[1]۔ اس کی اور بعض دوسری کتابوں کی مدد سے جو کچھ حالات دستیاب ہوئے ہیں انہیں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

بابا اسحاق کی خدمت میں شیخ احمد کی رسائی

بچپن میں بابا اسحاق سے شیخ احمد کے متوسل ہونے کے بارے میں دو روایتیں ہیں؛ پہلی روایت یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد دہلی کے باشندے تھے اور ان کا بچپن وہیں گزرا۔ ایک بار دہلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ سخت طوفان اور آندھی آئی جو ان کو وہاں سے کسی اور طرف لے گئی۔ چنانچہ مسافروں کی طرح بے یار و مددگار ہو گئے اور کسمپرسی کی حالت میں ادھر ادھر گھوم کر وقت گذارا کرتے تھے۔ ایک دن بابا اسحاق مغربی سے ملاقات ہوئی جو اس وقت کے بڑے کامل درویش تھے وہ انہیں اپنی قیام گاہ کھٹو میں لے آئے جو اجمیر کے قریب ایک گاؤں ہے۔ اس طرح بابا اسحاق مغربی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔

[1] مقدمہ مقالات شیرانی ج ۱ ص ۱۸ و ۱۹۔

دوسری روایت صاحب معارج الولایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ شیخ احمد کھتو کے پیرومرشد بابا اسحاق میرٹھ کی طرف آئے دریائے جون (جمنا) کے کنارے ایک توت کے درخت کے نیچے چند روز یاد خداوندی میں گزارے اور وہاں سے کھتو نامی موضع میں آکر مقیم ہوگئے۔ انہی دنوں دہلی میں زبردست طوفان آیا۔ تمام ماحول میں اندھیرا چھا گیا۔ دہلی کا ایک بچہ جسے اس کی دایہ گھر سے باہر لائی تھی تاریکی میں گم ہوگیا، اور ایک ایسے مقام پر جا پہنچا جہاں ایک قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح قافلے والوں نے ایک خوبصورت بچے کو دیکھا تو اسے اپنے ساتھ لے لیا اور دوآبہ (پنجاب) کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ بچہ ایک شخص نجیب نساج کے ہاتھ آگیا جو پنجاب کے ایک قصبے دہندائی سے روئی کی تجارت کو دہلی کو گیا ہوا تھا، چنانچہ وہ بچے کو اپنے گھر لے آیا۔ اتفاقاً مولانا شہاب الدین ہمدانی کے پوتے مولانا صدرالدین اسی گاؤں میں گئے ہوئے تھے۔ وہ جناب اسحاق سے ملنے کے لیے کھتو گئے، تو انہوں نے فرمایا کہ اگر ایک بچہ اس شکل وصورت کا ملے تو میرے لیے لانا۔ اس قصبہ میں جب انھوں نے اس بچے کو غور سے دیکھا تو وہ واقعی اسی شکل وصورت کا تھا جس کی خواہش حضرت شیخ اسحاق نے کی تھی چنانچہ نجیب نساج سے وہ بچہ لے کر حضرت کی خدمت میں آئے، انھوں نے اپنی فرزندی میں رکھ کر بچے کی پرورش کی اور اس کا نام شیخ احمد رکھا جو بعد میں شیخ احمد کھتو کے نام سے مشہور ہوئے۔

اس بچہ کی عمر اس وقت ۴ برس کی تھی، جب وہ بارہ ۱۲ سال کے ہوئے تو حضرت اسحاق اپنے ہمراہ انہیں دہلی میں بزرگان چشت کے مزارات کی زیارت کے لیے تشریف لے آئے، یہاں شیخ احمد کے بھائی نے انہیں پہچان لیا اور کہا یہ تو میرا بھائی

ملک نصیرالدین ہے وہ اندھیرے میں گم ہوگیا تھا۔ اس وقت ان کے والدین بھی زندہ تھے انھوں نے اصرار کیا مگر بچے نے شیخ اسحاق سے جدا ہونا قبول نہ کیا۔ ان دنوں مخدوم جہانیاں جہاں گشت قدس سرہٗ اوچ سے آکر دہلی میں قیام پذیر تھے، سلطان فیروز شاہ اور دوسرے امرائے سلطنت ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، شیخ اسحاق نے اپنے بیٹے شیخ احمد سے کہا اگر چاہو تو تمہیں مخدوم جلال الدین جہانیاں سے بیعت کرادوں انہوں نے کہا کہ میں آپ کا مرید ہوں۔ آپ ہی میرے مخدوم ہیں، مجھے نئی جگہ بیعت کی کیا ضرورت ہے۔ بچے کی بات سن کر شیخ اسحاق بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کے شہنشاہ تمہارے دروازے پر حاضری دیا کریں گے۔ شیخ اسحاق کی محبت کا یہ عالم تھا کہ شیخ احمد کھتو کو ایک لمحہ کے لیے نہیں بھولتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ایسے حسن وجمال سے نوازا تھا کہ جو بھی ان کو دیکھتا بے اختیار ہوجاتا تھا۔ ان کی آواز میں بڑی جاذبیت تھی۔ شیخ احمد کی عمر بیس سال ہوئی تو شیخ اسحاق نے لباس خلعت سے نوازا اور خرقۂ خلافت کے ساتھ ساتھ اپنے پیران کرام کے تبرکات اور روحانی امانتوں سے بھی نوازا اور خود فوت ہوگئے۔[1]

بابا اسحاق مغربی کا سلسلہ شیخ ابومدین مغربی سے ملتا ہے اور یہ اس قدر عالی سلسلہ ہے کہ صرف پانچ بزرگوں کے واسطہ سے سید الکونین فخر دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار میں

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ص۲۹۵، گلزار ابرار ص۱۴۳، اخبار الاخیار، تذکرہ اولیائے پاک وہند ص۱۹۵ تذکرہ صوفیائے میوات، نزہۃ الخواطر ص۴۵ ج۱۹۔

تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے سلسلہ کے تمام بزرگ ڈیڑھ سو برس سے زائد عمر کے ہوتے تھے۔

سفرِ حج | شیخ احمد کے پیر و مرشد حضرت بابا اسحاق مغربی ۱۱۶ سال کی عمر میں حسب روایت ۷۷۶ھ / ۷۵-۱۳۷۴ء میں فوت ہوئے، ان کا مزار کھٹو میں مرجع خواص وعوام ہے[1]۔ پیر و مرشد کی رحلت کے بعد وہ ۷۸۳ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے پٹن کے راستے سے کھمبایت تشریف لے گئے اور وہیں سے جہاز پر سوار ہوئے، اس وقت راستی خاں وہاں کے صوبہ دار تھے۔ پٹن میں راستی خاں کے والد فرحت الملک سے بھی ملاقات کی تھی[2]۔ حج کے بعد مدینہ منورہ روانہ ہوئے، جب قافلہ مدینہ منورہ کی سرحد میں داخل ہوا اور گنبد خضرا کا نظارہ ہوا تو ان پر والہانہ کیفیت طاری ہوئی، اونٹ سے اتر گئے اور پیادہ درود شریف کا ورد کرتے اور نعتیہ اشعار پڑھتے ہوئے دربار رسالت میں حاضر ہوئے۔

حجاز سے واپسی | حجاز سے واپسی پر ٹھٹھہ ہوتے ہوئے اُچھ پہنچے اور وہاں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے ملاقات کی اور ان کے فیوض و برکات سے مستفید ہوئے، اُچھ سے کھٹو پہنچے، پھر دہلی تشریف لے گئے اور مسجد خانجہاں میں قیام فرمایا۔

مسجد خانجہاں میں | مسجد خانجہاں میں زیادہ وقت مراقبہ، ذکر و فکر اور تحصیل میں گزرا، عبادت و ریاضت میں ایسے مشغول ہوئے کہ دن بھر روزہ سے رہتے اور شام کو کھلی کے ایک ٹکڑے سے روزہ افطار فرماتے اور جب چلہ کشی شروع

۱؎ تاریخ صوفیائے گجرات، ۲؎ خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۳۳

فرمائی تو شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ چالیس روز میں صرف ایک کھجور کھایا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت دہلی تشریف لائے جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ مسجد خانجہاں میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو ملاقات کے لیے پہنچے اور بڑی دعائیں دیں۔

تیمور کا حملہ | ۱۳۹۸ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ دہلی پہنچ کر اس نے تخت و تاج پر قبضہ کیا، اس وقت دہلی کا بادشاہ محمود تغلق تھا، تغلق دہلی چھوڑ کر گجرات چلا آیا، شیخ احمد کھٹو اس وقت دہلی میں مقیم تھے۔ تیمور کی فوج نے لوٹ مار کر کے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا جن میں یہ بھی تھے، اس کو جب انکی بزرگی اور کرامت کا حال معلوم ہوا تو اس نے رہائی کا حکم دے دیا اور سواری بھیج کر انہیں اپنے پاس بلا لیا، انھوں نے تیمور سے قیدیوں کی رہائی اور لوٹ مار اور قتل و غارتگری بند کرنے پر زور دیا۔ تیمور نے یہ بات مان لی اور ان کا معتقد ہو گیا[1]۔

سفر سمرقند | تیمور کی درخواست پر اس کے ساتھ شیخ احمد سمرقند پہنچے۔ سمرقند میں کچھ دن قیام کے بعد ہندوستان لوٹے، ہندوستان آتے ہوئے بلخ، ہرات اور قندھار بھی تشریف لے گئے، قندھار کے گورنر نے ان کا خیر مقدم کیا اور قیام کی درخواست کی جس کو منظور نہیں فرمایا اور ملتان تشریف لائے، پھر پٹن پہنچے اور سرکھیج میں سکونت اختیار فرمائی اور تادم حیات یہیں مقیم رہے۔

اخبار الاخیار میں گجرات تشریف آوری کا حال اس طرح لکھا گیا ہے کہ

۱؎ تاریخ صوفیائے گجرات۔

ظفر خاں جو فیروز شاہ کی حکومت کی طرف سے نہروالہ کا حاکم تھا اور سلطان مظفر کے لقب سے مشہور ہوا، اس نے دہلی کی اقامت کے دوران تعلقات کی بنا پر مجبور کیا کہ وہ گجرات تشریف لائیں اور یہیں مستقل سکونت اختیار فرمائیں چنانچہ سرکھیج میں رہنے لگے۔[1] شیخ ابوالقاسم نے کتاب الکبیر میں لکھا ہے کہ ۸۰۲ھ میں مظفر خاں کے دورِ حکومت میں گجرات آئے اور بدا بوہرہ نامی شخص کے یہاں قیام فرمایا اور بعد میں سرکھیج میں مستقل سکونت اختیار کی۔

سلطان مظفر خاں کی وفات کے بعد ان کے پوتے سلطان احمد تخت نشین ہوئے، وہ بھی شیخ احمد کے مرید ہو گئے تھے۔ ایک دن سلطان احمد نے التماس کی کہ حضور مجھے حضرت خضر سے ملایئے، فرمایا، میں حضرت خضر سے پوچھتا ہوں اگر وہ مان گئے تو بہتر۔ انہوں نے پوچھا تو حضرت خضر نے کہا، انہیں چالیس دن تک عبادت خداوندی میں رہنا چاہیے چنانچہ سلطان ایک ماہ تک چلہ میں رہے، پھر حکم ہوا کہ دو چلے مزید کاٹیں، تین چلے مکمل کر لیے گئے تو سلطان احمد حضرت شیخ احمد کے حجرے میں بیٹھے تھے کہ نماز صبح کے بعد حضرت خضر تشریف لائے دوران گفتگو سلطان احمد نے درخواست کی، حضور مجھے عجائبات دنیا سے کوئی حیران کن چیز دکھائیں، فرمایا، دریائے سابرمتی کے کنارے پر جہاں آج کل صحرا ہے ایک شہر آباد تھا، اس شہر کا نام تھا باداں باد۔ وہاں کے لوگ بڑے خوش حال اور امیر تھے، ایک دن مجھے بھوک لگی، میں اس شہر میں گیا ایک حلوہ فروش کی دکان پر پہنچا اور تیس تنکہ دے کر حلوہ خریدنا چاہا، دکاندار نے

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۱۳۲۔

مجھے دیکھتے ہی کہا تم مجھے درویش دکھائی دیتے ہو۔ میں تم سے پیسے نہیں لوں گا، یہاں حلوہ جس قدر چاہو کھا لو، کچھ عرصہ بعد میں پھر وہاں سے گزرا تو وہاں شہر، شہر والوں، بازاروں اور محلات کا نام و نشان نہیں تھا، ان کھنڈرات پر ایک ڈیڑھ سو سالہ بوڑھا بیٹھا نظر آیا۔ میں نے اس سے شہر کے حالات دریافت کیے تو کہنے لگا، شہر کا حال تو مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ ہاں میں نے اپنے بوڑھوں سے سُنا ہے کہ یہاں ایک شہر تھا جس کا نام باداں باد تھا۔ سلطان نے حضرت خضر سے اجازت لی کہ اگر آپ چاہیں تو میں اسی مقام پر ایک شہر آباد کرنے کا حکم دوں۔ حضرت خضر نے کہا۔ ہاں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن ایک شرط یہ ہے کہ سارے ملک سے ایسے چار اشخاص لائے جائیں جن کا نام احمد ہو اور انہوں نے اپنی (شعوری) عمر میں نماز عصر کی سنتیں بھی قضا نہ کی ہوں اور وہ اس شہر کا سنگ بنیاد رکھیں اور اس کا نام احمد آباد رکھا جائے۔ چنانچہ چار ایسے آدمی تلاش کرنے کا حکم دیا گیا۔ سارے ملک گجرات میں صرف دو اشخاص احمد نامی ملے۔ ایک قاضی احمد اور دوسرے ملک احمد تھے لیکن ان دونوں کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ملا، حضرت شیخ احمد نے فرمایا، تیسرا شخص احمد میں ہوں، سلطان احمد یہ سُن کر کہنے لگا چوتھا احمد میں ہوں۔ آج تک میری عصر کی سنتیں قضا نہیں ہوئیں۔ چنانچہ چاروں ملکر دریائے سابرمتی کے کنارے پہنچے حضرت خضر نے جس جگہ کی نشاندہی کی تھی، وہاں ۷ ذیقعدہ ۸۱۳ھ کو احمد آباد کی بنیاد رکھی۔ اطراف میں تین سو ساٹھ پورے بنائے گئے۔ ہر ایک پورہ ایک مکمل شہر تھا، چنانچہ عثمان پورہ میں صرف کاریگروں کی دکانیں دس بارہ ہزار تھیں۔

مرآۃ سکندری میں لکھا ہے کہ گجرات کے سلطان احمد نے احمد آباد کی بنیاد ڈالی، اس کی تعمیر کا آغاز ذیقعدہ ۸۱۳ھ/۱۴۱۱ء اور اختتام ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء میں ہوا۔ احمد نام کے چار آدمیوں نے اس کی بنیاد رکھی، یعنی قطب المشائخ شیخ احمد کھتو۔ سلطان احمد دوسی کا ایک سرا سلطان نے پکڑا اور دوسرا شیخ احمد نے، شیخ احمد اور ملا احمد۔ اسی سلطان نے ۱۴۱۴ء/۸۱۶ھ میں مانک چوک کے قریب ایک عظیم الشان مسجد بنوائی، جس میں "ملوک خانہ" کے علاوہ تین سو باون ستون تھے، دروازۂ ملوک خانہ میں بارہ تخت ملوک خانہ میں آٹھ اور جنوبی و شمالی بازوؤں میں دو سو بارہ ستون تھے اور اسی طرح دیگر بہت سے ستونوں کے علاوہ ۹۸ گنبد تھے۔ محمود ثانی کے زمانے میں دستور تھا کہ ربیع الاول کی یکم سے بارہویں تک علماء، صلحاء اور مشائخ وغیرہ ان کے دربار میں حاضر ہوتے، بخاری شریف کا درس ہوتا۔ بارہویں کو سلطان خود آنے والوں کی خدمت کرتے، ان کے ہاتھوں پر پانی ڈالتے اور وزیر طشت پکڑے رہتے، اس روز بہت زیادہ نقدی اور پارچہ انعام میں دیا جاتا۔[1] اس طرح ۸۱۳ھ میں شہر احمد آباد کا سنگ بنیاد انکے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا۔

شیخ احمد کھتو جب سنگ بنیاد رکھنے کے لیے تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں ایک بزرگ کو دیکھا، ان بزرگ نے ان کو آواز دی، یہ ان کے پاس گئے، تھوڑی دیر تک دونوں بزرگ بیٹھے رہے، اس کے بعد وہ ان سے اجازت لے کر رخصت ہوئے اور پھر احمد آباد کا سنگ بنیاد رکھا گیا، کچھ عرصہ بعد حضرت شیخ احمد کھتو سے کسی خادم

لہ مرآۃ سکندری ص ۲۵، ۲۴، ۲۷، ۲۸، بحوالہ تاریخ ادبیات ج ۴ ص ۵۴۹۔

نے دریافت کیا کہ وہ بزرگ کون تھے، فرمایا کہ وہ حضرت خضر تھے، انہوں نے فرمایا تھا کہ جاؤ بنیاد رکھو بہت اچھا شہر ہوگا۔[1]

شہر کی تاسیس کے بعد ۸۱۳ھ میں احمد آباد کی جامع مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا، جس کی تاریخ ان کلمات سے نکلتی ہے "خیر و بخیر"

سلاطین سے تعلقات

شیخ احمد کھتو نے دہلی اور گجرات کے کئی سلاطین کا زمانہ دیکھا، فیروز تغلق، غیاث الدین تغلق، ابوبکر تغلق، ناصر الدین تغلق، محمود تغلق یہ سارے شاہان دہلی ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے، گجرات کے بادشاہوں میں بھی سلطان مظفر شاہ، احمد شاہ اور سلطان محمد معتقد تھے، بلکہ احمد شاہ نے تو انکے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی۔[2]

شیخ احمد کھتو کی سوانح

محمود بن سعید ایرجی نے تحفۃ المجالس کے نام سے شیخ کے ملفوظات جمع کیے تھے، اس میں سوانح و کوائف بھی دیے ہیں اور عبادت و ریاضت، کشف و کرامات اور تبحر علمی کے بہت سے واقعات بھی مرقوم ہیں۔ چند واقعات درج ذیل ہیں:

شیخ خود فرماتے ہیں کہ یہ فقیر جب زیارت خانۂ کعبہ کے ارادہ سے جہاز پر سوار ہوا تو ایک دن وضو کرنے میں اتفاق سے پاؤں پھسل گیا اور میں سمندر میں جا گرا۔ گرتے ہی یا حافظ یا حفیظ یا رقیب یا وکیل یا اللہ کا ورد کرتا رہا۔ میں پانی کی سطح پر تھا اور یہ وظیفہ زبان پر تھا، اتنے میں مجھے اپنے پاؤں کے نیچے پتھر سا معلوم ہوا، میں اس پر کھڑا ہو گیا۔ پانی کمر تک تھا، میں نے ان اسمائے مبارکہ کا ورد برابر جاری رکھا، اس کے بعد ملاحوں نے مچھلی کی طرح اوپر اٹھا لیا، اس کے ساتھ ہی

لہ تاریخ صوفیائے گجرات بحوالہ تاریخ سلاطین گجرات ۲ تاریخ صوفیائے گجرات بحوالہ ہسٹری آف گجرات۔

شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے مکہ مکرمہ پہونچ کر حج کیا اور مدینہ منورہ کو روانہ ہوا، مدینہ منورہ میں ہمارے ساتھ امام خانجہاں اور شیخ تاج الدین سرکھجی کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے، ہم مسجد نبوی میں تھے، ساتھیوں نے کہا کھانے کا انتظام کرنا چاہیے، میں نے کہا کہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان ہوں، وہ لوگ باہر گئے اور کھانے سے فارغ ہو کر واپس آئے، ہم نے ایک ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، نماز پڑھ کر وہ حضرات سو گئے اور میں تسبیح میں مشغول ہو گیا، ناگہاں آواز آئی، رسول اللہ کا مہمان کون ہے؟ میں نے خیال کیا کسی اور کو آواز دی جا رہی ہے پھر دوسری اور تیسری بار جب یہ آواز آئی تو میں سمجھا کہ یہ آواز مجھے دی جا رہی ہے، میں اٹھا اور اس کے سامنے گیا۔ دیکھا کہ وہ شخص ایک طبق ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے۔ میں نے دامن پھیلا دیا، اس نے کھجوریں میرے دامن میں ڈال دیں اور طبق لے لیا، وہ کھجوریں میں نے کھائیں وہ اتنی لذیذ اور میٹھی تھیں کہ اس کا بیان نہیں ہو سکتا، کھجوریں کھا کر سو گیا۔ رات کو ایک خواب دیکھا اور یہی خواب میرے ساتھیوں نے دیکھا کہ:

"ایک نہایت پُر فضا مقام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام تشریف فرما ہیں اور ایک عورت زیور سے آراستہ وہاں موجود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس عورت کو قبول کر لو۔ میں نے عرض کیا کہ بابا (اسحاق) نے قبول نہیں کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ فرمایا، میں نے دیکھا تو حضرت علی اپنی انگلی دانتوں میں دبائے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ بابا احمد رسول اکرمؐ کے حکم کی تعمیل کرو اور اس عورت

کو قبول کر لو۔ چنانچہ میں نے اس عورت کو قبول کر لیا"

شیخ احمد کھٹو فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ عورت دنیا کی صورت مثال تھی۔ آج جو ہمارے یہاں دنیا کی بہتات ہے وہ حضرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ ہے۔

مدینہ منورہ سے واپسی کے وقت ہم تینوں ساتھی آخری سلام کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پہ حاضر ہوئے۔ روضۂ مبارک کے خدام دس گز کے فاصلے پر ہاتھوں میں کالے دستانے چڑھائے کھڑے تھے۔ مجھ سے کہا یہ عمامہ لو، میں نے جواب دیا ہمارے مرشد نے عمامہ نہیں باندھا، وہ ٹوپی پہنتے تھے، اس پہ خدام نے کہا، رات خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ آپ کو دس گز کپڑا عمامہ باندھنے کے لیے دیا جائے اور ارشاد فرمایا ہے کہ احمد کو ہمارا حکم ہے کہ یہ عمامہ اپنے سر پہ باندھے اور مخلوق خدا کو اسلام کی دعوت دے، چنانچہ وہ کپڑا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عطیہ تھا میں نے ہاتھ میں لیا اسکو چوما اور سر پہ باندھ لیا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، آپؐ نے ارشاد فرمایا دہلی کی مسجد خانجہاں میں رہ کر پہلے سے زیادہ ریاضت و عبادت اور مجاہدہ کیا جائے۔ اسی اثنا میں سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں کو بھی یہ ندائے غیبی سُنائی دی کہ ایک جوان صالح دہلی کی مسجد خانجہاں میں مشغول عبادت ہے اور بہت ہی ریاضت کر رہا ہے، چنانچہ جب ہم حج سے واپس آئے تو مسجد خانجہاں میں سید جلال الدین میری ملاقات کو تشریف لائے وہ مسجد کے قریب پہونچے تو ان کے ایک معتقد نے آکر مجھے اطلاع دی کہ مخدوم جہانیاں

آپ سے ملنے کے لیے آرہے ہیں، میں فوراً اٹھا اور مسجد کے دروازے پر پہونچا، وہ پالکی پر سوار تھے پالکی سے اترے اور نہایت شفقت و پیار سے مجھے گلے لگایا، دیر تک سینے سے لگائے رکھا، پھر پالکی میں بیٹھ کر واپس تشریف لے گئے۔

ایک جگہ سفر کا تذکرہ ہے، فرماتے ہیں۔ اس فقیر نے بلا کسی رفیق اور سامان کے تنہا سفر کیا ہے اور پورے گیارہ سال تک برہنہ پا۔ جس شہر اور قصبہ میں جاتا وہاں کی مسجد میں رات بسر کرتا۔ یہ سفر اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر اور ریاضت و مجاہدہ کے سلسلے میں ہوتے تھے، ایک دن فرمایا فقیروں کی مجلس میں آنا آسان ہے، مگر وہاں سے اپنے کو صحیح و سالم واپس لے جانا مشکل ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں ایک دفعہ سمرقند کی مسجد میں جا پہونچا۔ وہاں ایک فقیہ طلبہ کو پڑھا رہا تھا، میں فقیروں کی سی ٹوپی اور درویشوں کے لباس میں تھا، طلبہ سے دور ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک طالب علم حسامی پڑھ رہا تھا۔ اس نے غلط اعراب پڑھے۔ میں نے آواز سے کہا کہ "اعراب غلط میخوانی" میری آواز سنتے ہی فقیہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھ سے ملا، وہاں سے اٹھ کر اپنی مسند درس کے قریب لے گیا۔ علم اصول کے بارے میں مجھ سے کچھ سوالات پوچھے، میں نے صحیح جواب دیا۔ میری علمی جانچ کر کے مجھ سے بولا، اس علم کے باوجود یہ معمولی کپڑے اور فقیروں سی ٹوپی کیوں پہن رکھی ہے، میں نے جواب دیا اگر عمدہ کپڑے پہنوں تو نفس بد خوئی کی طرف مائل ہو جائے گا، اس لیے اس فقیر نے اپنے آپ کو اس لباس میں چھپا رکھا ہے"

ایک مرتبہ فرمایا کہ ایک دفعہ بہت بڑا تاجر تقریباً تیس سیر مصری اور مشک کا ایک نافہ ہمارے پاس اس زمانے میں لایا جب کہ ہم مسجد خانجہاں میں تھے میں نے

ان سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آرہے ہیں اور ہمیں کب سے جانتے ہیں اس نے جواب دیا کہ میں شیخ نور کا مرید ہوں جو پنڈوہ میں رہتے ہیں اور میں اس وقت وہیں سے آرہا ہوں، اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ دہلی آچکا ہوں، گذشتہ دنوں دہلی سے سامان تجارت کی خرید و فروخت کے بعد شیخ نور کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ دہلی میں کن کن مشائخ سے ملاقات کی؟ میں نے جن جن بزرگوں سے ملاقات کی تھی سب کے نام بتا دیے، شیخ نے دریافت کیا کہ شیخ احمد کھٹو سے بھی ملے، چونکہ آپ سے نہیں ملا تھا اس لیے خاموش ہو گیا، شیخ نے فرمایا کہ جب شیخ کھٹو سے نہیں ملے تو تمہارا دہلی جانا بالکل بے کار ہے، اسکے بعد پریشانی کی حالت میں وہاں سے روانہ ہوا اور شیخ کے حکم کے مطابق آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

اس کے بعد فرمایا اس شخص کے پیر و مرشد سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی انہوں نے اپنے کشف سے جو خدا کی ایک خاص نعمت ہے مجھے خود ہی پہچان لیا"

شیخ احمد کھٹو کے مرید محمود بن سعید ایرجی اپنی کتاب تحفۃ المجالس میں لکھتے ہیں کہ سلطان فیروز کو بھی شیخ کھٹو سے بہت عقیدت و محبت تھی، امیر تیمور کے دہلی آنے سے پندرہ دن قبل شیخ نے اپنے کچھ مریدوں اور خود سلطان فیروز کو اس کے دہلی پر قابض ہونے کی خبر دے دی تھی، چنانچہ سلطان فیروز شیخ کی پیشین گوئی کی وجہ سے دہلی چھوڑ کر جونپور چلا گیا، شیخ کو بھی فیروز نے ساتھ چلنے کو کہا مگر انہوں نے فرمایا کہ ہمیں تو دہلی والوں کے ساتھ ہی رہنا ہے، بالآخر شیخ اور آپ کے کچھ متعلقین مغلیہ فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے، آپ کی بزرگی اور عظمت کی جب امیر تیمور کو اطلاع ہوئی تو اس نے ان تمام لوگوں کو جو شیخ کے ہمراہ گرفتار ہوئے تھے بڑی عزت و

ادب سے رہا کر دیا۔

شیخ فرماتے تھے کہ ہمارے ساتھ چالیس فقیر جیل میں قید تھے، غیب سے روزانہ اللہ تعالیٰ ہمارے پاس چالیس گرم گرم روٹیاں بھیج دیا کرتا تھا۔

فرمایا کہ میں ننگے پاؤں اور بلا کسی ساز و سامان کے سفر کیا کرتا تھا اور کسی شہر یا بستی میں پہونچکر رات مسجد میں گذارتا تھا، خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے ناپاکی سے بھی محفوظ رکھا۔ میں ہمیشہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتا رہا، سفر میں بھی روزے رکھتا اور غیر معمولی ریاضت کرتا، اگرچہ سفر میں مشقتیں اور تکلیفیں بے شمار ہوتی ہیں لیکن میرا دل ہمیشہ مسرور رہتا تھا۔ میں برہنہ پا اور پیادہ اس لیے سفر کرتا تھا کہ حدیث شریف ہے وامشوا حفاۃ عراۃ سترون اللہ جہرۃ ای عیانا۔

شیخ عبدالحق نے لکھا ہے کہ شیخ احمد کھٹو کے یہاں فقراء، امراء و سلاطین ہر ایک کے لیے دستر خوان وسیع تھا۔

صاحب تحفۃ المجالس لکھتے ہیں کہ ایک رات شیخ احمد نے مولانا محمد قاسمؒ سے کہا کہ تم فلاں گاؤں چلے جاؤ، قصہ یہ تھا کہ مولانا نماز تراویح میں تمام قرآن سن چکے اور صرف سبح اسم ربک کے بعد والا حصہ باقی رہا تھا، ان کے دل میں خیال آیا کہ آج رات قرآن سُن کر صبح سویرے فلاں کام کے لیے فلاں جگہ روانہ ہو جاؤں گا، شیخ احمد نے فرمایا کہ مولانا آپ ابھی فلاں گاؤں چلے جائیں مگر مولانا اس خیال سے خاموش رہے کہ اگر نفی میں جواب دیتا ہوں تو شیخ ناراض ہو جائیں گے اور اگر چلا جاتا ہوں تو قرآن کریم پورا نہ سُن سکوں گا، چنانچہ شیخ نے پھر حکم دیا کہ آپ

فلاں گاؤں ابھی چلے جائیں۔ شیخ کے اس حکم پر مولانا سلام کر کے اس گاؤں کی جانب روانہ ہو گئے، جہاں انکو جانا تھا، اس گاؤں کا نام قصبہ دھولکہ تھا چنانچہ مولانا قصبہ دھولکہ پہونچے تو اس وقت عشاء کی نماز کا وقت ہو چکا تھا اس لیے وضو کر کے فوراً مسجد میں چلے گئے، امام کے ساتھ عشاء کے فرض پڑھے پھر نماز تراویح شروع ہوئی تو امام نے سورہ سبح اسم ربک ہی سے پڑھنا شروع کیا اور مولانا کا قرآن ختم ہو گیا۔

پھر مولانا کام سے فارغ ہو کر اس گاؤں سے واپس آئے اور شیخ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت معاف فرمائیں میں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں ذرا تامل اس لیے کیا تھا کہ مجھے اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں تمام قرآن سننے کی سعادت سے محروم نہ رہوں۔ شیخ احمد نے فرمایا کہ مولانا! تمہارے کسی دنیاوی کام کی وجہ سے شیخ دینی کام میں نقصان واقع نہیں ہونے دے گا۔

وفات | حضرت شیخ احمد کھٹو ایک طویل مدت رشد و ہدایت فرماتے رہے۔ جب زندگی کے ایک سو گیارہ سال ہوئے تو خدا کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ چنانچہ محمد شاہ کے زمانہ میں ۱۴ شوال ۸۴۹ھ / ۱۴۴۵ء کو واصل بحق ہوئے۔

صاحب خزینۃ الاصفیاء فرماتے ہیں، حضرت شیخ احمد کی عمر ایک سو سال سے تجاوز کر گئی تھی، شیخ صلاح الدین کو جو راجپوت کا لڑکا تھا اور بچپن سے انکے زیر تربیت رہا تھا، اپنا جانشین بنایا اور خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔ آپ ایک سو گیارہ سال کی عمر میں واصل بحق ہوئے۔[1]

شرح جلال اور معارج الولایت میں لکھا ہے کہ شیخ کی ولادت ۷۳۸ھ میں

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، صفحہ ۳

ہوئی تھی اور ایک سو گیارہ سال کی عمر میں بروز جمعرات دس ماہ شوال ۸۴۹ھ میں فوت ہوئے، یہ زمانہ سلطان محمد بن سلطان احمد بادشاہ گجرات کا تھا، صاحب معارج الولایت نے سن ولادت مخدوم الاولیا (۷۳۸ھ) اور سن وفات قطب الاولیا (۸۴۹ھ) اور سن عمر قطب (۱۱۱) سے نکالا ہے، احمد آباد سے قریبی فاصلہ پر آپ کا مزار پُر انوار موضع سرکھیج میں واقع ہے۔

شیخ احمد بود مرغوب خدا   رہنمائے حق فقیر بے نظیر
امجد آفاق (۷۳۸ھ) احمد مجتبیٰ (۷۳۸ھ)   سرور دین مصرع تولیدش بگیر

شیخ نے عمر بھر نکاح نہیں کیا اور اپنی عمر ترک و تجرید میں گزار دی۔[1]

جہانگیر بادشاہ کی مزار پر حاضری | جہانگیر اپنی توزک میں لکھتے ہیں:

"۲۷ ماہ بہمن ۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء) کو مبارک شنبہ جمعرات کے دن باغ فتح کی سیر کے لیے گیا جو موضع سرخیز میں واقع ہے، راستے میں ایک ہزار پانسو روپے نچھاور کیے، چونکہ شیخ احمد کھٹو کا مزار سرِ راہ واقع تھا اس لیے وہاں حاضر ہو کر فاتحہ خوانی کی، کھٹو ایک قصبے کا نام ہے جو سرکار ناگور میں واقع ہے، یہی قصبہ شیخ احمد کھٹو کی پیدائش گاہ ہے، شیخ سلطان احمد کے زمانے میں تھے جس نے شہر احمد آباد کی بنیاد رکھی تھی، سلطان احمد شیخ سے نہایت عقیدت و اخلاص رکھتا تھا، اس علاقے کے لوگ بھی ان سے نہایت عقیدت رکھتے ہیں اور انہیں اکابر اولیاء میں شمار کرتے ہیں، ہر جمعہ کی شب میں ان کے مزار پر شریف و وضیع ہر قسم کے لوگ کثرت سے زیارت کے لیے حاضر ہوتے ہیں، سلطان محمد کے

[1] خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۳۳۔

بیٹے سلطان احمد نے شیخ کے مقبرے، مسجد اور خانقاہ کی عالی شان عمارتوں کی بنیاد رکھی تھی اور مقبرے کے متصل جنوبی حصے میں ایک بڑا تالاب بنوایا تھا، تالاب کے گرد و پیش کو پتھر اور چونے سے پختہ کیا تھا، یہ عمارتیں محمود کے بیٹے قطب الدین کے زمانے میں مکمل ہوئیں، تالاب کے کنارے شیخ کے مزار کی پائنتی میں گجرات کے سابقہ بادشاہوں کے مقبرے بنے ہوئے ہیں، گنبد کے اندر سلطان محمود بیگڑہ اور اس کا بیٹا سلطان مظفر اور اس کا پوتا محمود شہید، جو سلاطین گجرات کا آخری فرمانروا تھا، ابدی نیند سو رہے ہیں۔ سلاطین گجرات کے مقبرے کے قریب ان کے امراء کے گنبد ہیں، بلا شبہ شیخ احمد کھٹو کے مقبرے کی عمارت نہایت عالی شان اور اس کا محل وقوع نہایت نفیس ہے، تقریباً پانچ لاکھ روپے اس عمارت پر صرف ہوئے ہونگے، واللہ اعلم بالصواب۔"[1]

مرآۃ احمدی میں ہے کہ سلطان محمود بیگڑہ اور سلطان مظفر حلیم ان کے پائنتی مدفون ہیں، اسی طرح تمام خدام اور خلفا بھی وہیں دفن ہیں۔[2]

شیخ کا مدرسہ | حضرت شیخ احمد کھٹوی متوفی ۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء نے سرخیز (سرکھیج) میں خانقاہ، مسجد اور تالاب بنوائے تھے، وفات پا جانے پر محمد شاہ دوم نے ان کا مقبرہ اور مدرسہ وغیرہ بنوایا، اس کے ساتھ طلبہ کے رہنے کے لیے ایک دار الاقامہ بھی تھا جو عرصہ تک قائم رہا، ۱۹۲۱ء تک اس کے حجروں کے آثار موجود تھے، محمود اور انکے لڑکے مظفر کے عہد میں حسن العرب اس مدرسہ کے افسر اعلیٰ تھے۔[3]

کتب خانہ | سرکھیج میں شیخ احمد کھٹو مستقلاً قیام پذیر تھے، جہاں اپنی زندگی میں

[1] توزک جہانگیری ص ۴۴-۳۴۳ [2] خاتمہ مرآۃ احمدی ص ۳۳ [3] گجرات کی تمدنی تاریخ ص ۱۹۵۔

انہوں نے مسجد، تالاب اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ محمد شاہ نے آپ کے بعد اسی جگہ مقبرہ
اور ایک مدرسہ بنوایا، جس میں کتب خانہ بھی رہا ہوگا، لیکن شیخ احمد کھٹو کے پاس
اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا، چنانچہ ایک موقع پر حدیث کی کتاب مصابیح اپنے
کتب خانہ سے نکال کر حاضرین مجلس کو ایک حدیث سنائی تھی[1]، مرقاۃ الوصول
میں ہے کہ قاضی عبدالرزاق مبارک ابوالحیٰ جو آپ کے مخلص ملازموں میں سے
تھے، وہ اس کتب خانہ کے ناظم اور کاتب تھے، لوگ ان کو قاضی بڈھ مبارک
بھی کہتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اتنی زیادہ کتابیں تھیں کہ اسکے
انتظام کے لیے ایک مستقل ناظم اور کاتب رکھنا پڑا، حضرت شیخ کتابوں کے
مطالعہ کے بڑے شائق تھے[2]

[1] تحفۃ المجالس قلمی مجلس ۸ ۳ [2] مرقاۃ الوصول ص ۵ بحوالہ گجرات کی تمدنی تاریخ صفحہ ۲۲

علم تفسیر کی اہمیت اور تفسیر ایجاز البیان کا ایک نادر مخطوطہ

حکیم سید محمد احمد ٹونکی

قرآن کریم کو جو عظمت و رفعت ساری کتابوں پر حاصل ہے وہ کبھی کسی زمانہ میں
کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی اور کبھی حاصل ہو بھی نہیں سکتی، اس لیے کہ کتابیں خاص
موضوع خاص زمانے یا خاص ضرورت تک محدود ہوا کرتی ہیں اور کتاب اللہ زمان
و مکان کی قیود سے بالاتر ہے۔ یہ خالق و مالک کا وہ کلام ہے جو پوری زندگی کے واسطے
قانون ابدی و سرمدی کے طور پر نازل فرمایا گیا ہے۔ خود قرآن کریم نے اپنی صداقت و
کمال پر "فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ" (ایسی ایک ہی سورہ لادو) فرماکر چیلنج کیا ہے
جس کے جواب میں منکرین تک کی زبان سے "مَا هٰذَا قَوْلُ الْبَشَرِ" (یہ آدمی کا قول
نہیں) کہتے ہوئے حقیقت کا اعتراف ہوا ہے "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" (اس
کتاب میں کوئی شک نہیں) ہر طرح صحیح و مسلم ہے اور جو بلندی قرآن حمید کو تمام کتابوں
پر حاصل ہے، وہی رفعت و سربلندی علم تفسیر کو دوسرے علوم و فنون پر حاصل ہے
تفسیر کتاب الٰہی سے تعلق رکھنے والا وہ علم ہے جس کی برابری کسی علم کو حاصل نہیں اور ہر
علم کی فضیلت و بزرگی اس کے موضوع اور غایت کے اعتبار سے ہوتی ہے علم تفسیر
کا موضوع چونکہ قرآن کریم کے معانی و مطالب کی وضاحت ہے اس لیے اسے اشرف علوم

اور افضل واعظم کہنا بجا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں قرآن فہمی کا ذوق وشوق پایا جاتا رہا ہے اور جس طرح صحابۂ کرام میں مفسرین پائے جاتے تھے اسی طرح تابعین وتبع تابعین اور ان کے بعد کے دور میں بھی علمائے تفسیر موجود رہے اور ہر طرح کی تفاسیر لکھی جاتی رہیں اور ممالک عربیہ ہی میں نہیں بلکہ ممالک عجم میں بھی بہت کثرت سے تفسیر کے خادم ہوئے ہیں۔

لفظ تفسیر "فسر" سے مشتق ہے اور اس کے معنی کھولنے، اظہار کرنے اور بے حجاب کرنے کے ہیں اسی لیے قرآن کے معنی ظاہر کرنے کو تفسیر کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید ایک بحر زخار ناپیدا کنار ہے ناممکن ہے کہ کوئی اس کے علوم اس کے اسرار اس کے حکم، اس کے مطالب اور اس کے معانی کا کما حقہ استقصاء اور استحصار کر سکے اس لیے فرمایا گیا ہے وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے) اور ووجب العنایۃ بالقصل الممکن لان کانت علوم القرآن لا تحصی ومعانیہ لا تقصی (بقدر امکان اعتنا ضروری ہے، کیونکہ قرآنی علوم حد شمار سے باہر ہیں اور اس کے معانی کا استقصاء نہیں کیا جا سکتا) ہر شخص اپنے علم اور اپنی سمجھ اور اپنے غور وفکر کے اعتبار سے جتنا ہو سکتا ہے استفادہ کرتا ہے۔ فقیہ اس سے احکام فقہی اور حلال وحرام کے مسائل معلوم کرتا ہے متکلم اس سے وحدانیت کے دلائل تک پہنچتا ہے فلسفی اس سے ذات، واجب، ممکن، حادث اور قدیم کے براہین پاتا ہے اور عارف وسالک حقیقت ومعرفت کے اسرار ورموز سے بہرہ ور ہوتا ہے، واعظ ومتذکر اس کے اخبار وقصص سناتا ہے اور نصیحت وعبرت حاصل کرتا ہے، نحوی اس سے قواعد اعراب کا اظہار کرتا ہے، علم بدیع ومعانی سے تعلق رکھنے والا اسلوب بیان وترتیب الفاظ

وجل پر مرشتا ہے۔ ایک حق گو شاعر کا یہ قول کتنا صحیح اور برمحل اعتراف ہے

جمیع العلم فی القرآن لکن — تقاصر عنہ افہام الرجال

(ترجمہ) سب علوم قرآن میں موجود ہیں، لیکن لوگوں کی سمجھ اسے جاننے سے قاصر ہے

"سیوطی" نے اتقان میں بیان کیا ہے کہ یہ کتاب الٰہی ایک دودھ کے برتن کے مانند ہے، تم اس کو جتنا متھوگے اسی قدر اس سے مکھن نکلتا رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جتنا بھی اس میں غور وفکر کیا جائے گا اس سے استفادہ کیا جاتا رہے گا۔

دنیا میں صرف یہی کتاب ہے جس سے سب سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے۔ ہر ہر موضوع کے اعتبار سے بے شمار تفاسیر لکھی گئیں اور مفسرین نے قرآن کے کسی پہلو کو نہیں چھوڑا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے دور میں قیل وقال اور موشگافیاں نہیں تھیں لیکن جب اسلام "جزیرۂ عرب" سے نکل کر "عجم" میں پھیلا اور علوم وفنون کی تدوین ہوئی فلسفہ اور منطق اور دوسرے علوم پیدا ہوئے اور علمی وفنی موشگافیاں ہونے لگیں اور قرآن کو صرف عقل کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا تو بھی ہر مسئلہ کا کافی وشافی جواب اس سے ملا اور آئندہ بھی قیامت تک جتنے بھی جدید علوم پیدا ہونگے ان کا جواب بھی قرآن مجید سے ملتا رہے گا۔ چودہ سو سال کے عرصہ میں قرآن مجید پر جتنا کام ہوا ہے اور جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں اور جتنے لوگوں نے اس کے لیے اپنی زندگی وقف کی ہے اس سے بادی النظر میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے

حریفاں بادہا خوردند ورفتند — تہی خمخانہ کردند ورفتند

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بقول علامہ سیوطی کلما مخضتہ اخرجت زبدتہ، دفتر کے دفتر لکھے گئے، لکھے جاتے رہیں گے لیکن کلام الٰہی کے محاسن نہ پورے

ہوئے ہیں اور نہ آئندہ پورے ہوسکیں گے، شراب حقیقت کا یہ خم خانہ کبھی خالی ہونے والا نہیں ہے۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْۢ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ

بعض فضلا کے نزدیک وقت کے تقاضوں کے مطابق ہر موضوع اور ہر مطلب پر سیر حاصل گفتگو کرنا ضروری تھا، چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے امام رازی نے "تفسیر کبیر" جیسی مبسوط تفسیر مرتب کی اور بعض اکابر کی نظر میں اختصار کی اہمیت تھی، اس کے لیے تفسیر جلالین۔ تفسیر مدارک اور تفسیر ایجاز البیان جیسی تفسیریں لکھی گئیں، اس مقالہ میں اسی موخر الذکر تفسیر پر بحث و گفتگو مقصود ہے۔ یہ بیجا طوالت اور اختصار مخل سے خالی اور چھٹی صدی ہجری کی تفسیر ہے اور مختصر ہونے کے باوجود بڑے قیمتی مواد پر مشتمل ہے، اس کے مرتب "نجم الدین ابوالقاسم محمود بن ابی الحسن النیشاپوری القزوینی" ہیں وہ اپنے دور کے بڑے فاضل، محدث، فقیہ، ادیب اور شاعر تھے۔ "بیان الحق" کے نام سے معروف تھے۔ یہ نادر تصنیف خجند میں ۵۵۳ھ/۱۱۵۸ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور چند صدیوں تک علماء کے درمیان متداول رہی اکثر تذکروں میں اس تصنیف اور اس کے مصنف کے تذکرے اختصار کے ساتھ ملتے ہیں۔ مثلاً معجم الادباء للیاقوت، بغیۃ الوعاۃ للسیوطی، کشف الظنون لحاجی خلیفہ، الاعلام لزرکلی۔ معجم المولفین لعمر کحالہ وغیرہ۔ معجم المولفین اور اعلام میں مصنف کا ذکر مکمل حوالوں کے ساتھ موجود ہے لیکن صاحب اعلام نے اس کے کسی نسخہ کے محفوظ موجود ہونے کی صراحت نہیں کی ہے، ہماری معلومات کی حد تک اس نادر تصنیف کے نسخے اب دنیا میں ناپید ہیں، مشہور مستشرق "براکلمان" (جرمنی) نے اس تفسیر کا کوئی نسخہ "اسپین" میں

ہونا ظاہر کیا ہے، لیکن دوسرے حوالوں سے اس کا بھی کوئی پتہ نہیں چلتا۔ راجستھان میں ریاست ٹونک کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اس کا نادر ترین نسخہ یہاں کے مشہور کتبخانہ میں موجود ہے، یہ کتب خانہ ریاست ٹونک کے تیسرے رئیس نواب[1] محمد علی خاں صاحب بہادر مرحوم مغفور کا قائم کیا ہوا جو بعد میں کتب خانہ عبدالرحیم خاں[2] اور کتب خانہ سعیدیہ[3] کے نام سے متعارف رہا، اب راجستھان سرکار نے مستقل حیثیت دیکر "عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک" کے نام سے ڈائرکٹریٹ[4] قائم کر دی ہے اور اسے پورے راجستھان کے تمام عربی فارسی قلمی اور مطبوعہ ذخیرہ کا مرکز بنا دیا ہے، "ٹونک" کا یہ مخطوطہ قدیم ہے اور مکمل نسخہ ہے۔ اس مخطوطہ کی کتابت ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں ہوئی اور کاتب عبداللہ بن محمد بن محمد ترمذی ہیں، ساڑھے سات سو سال گزر جانے کے بعد بھی یہ نسخہ نہایت صاف اور ما یقرء ہے البتہ مرور زمانہ سے کئی جگہ سے کچھ حروف اور جملے اور بعض جگہ سے کچھ سطریں مٹ گئی ہیں۔ ادارہ کی جانب سے بغرض حفاظت اس کا لیمینیشن ہو گیا ہے، اس کا یہ تو فائدہ ہوا کہ

---

[1] نواب محمد علی خاں، ریاست ٹونک کے تیسرے رئیس ہیں، انگریزوں نے ناراضگی کی وجہ سے انہیں گدی سے نیچے اتار دیا تھا اور "شہر بنارس" (یوپی) میں نظر بند کر دیا تھا اور انکی جگہ انکے بیٹے "ابراہیم علی خاں" کو نواب بنا دیا تھا، نواب محمد علی خاں بڑے بہادر، علم دوست اور خود بھی عالم تھے، انہیں کتابوں سے بہت شغف تھا۔

[2] صاحبزادہ عبدالرحیم خاں، نواب محمد علی خاں کے بیٹے کا نام ہے، کتب خانہ ان ہی کے زیر نگرانی رہا اسلئے کتبخانہ عبدالرحیم خاں کے نام سے مشہور ہوا

[3] نواب ابراہیم علی خاں کے بعد نواب سعادت علی خاں نواب بنائے گئے سعید الدولہ خطاب تھا، اسی مناسبت سے کتبخانہ کا نام "کتبخانہ سعیدیہ" ہوا

[4] یہ ڈائرکٹریٹ آج کل ضبط اور تنزل میں ہے اس کے ڈائرکٹر صاحبزادہ شوکت علی خاں کو سرکار نے بعض الزامات لگا کر معطل کر دیا ہے۔

نسخہ بہت محفوظ ہوگیا لیکن اس کی وجہ سے بعض سطور اور بعض صفحات ہلکے ہوگئے ہیں، یہ مخطوطہ قدیم دبیز غیر مجدول کاغذ پر قدیم خط میں لکھا گیا ہے، صفحات کل ۳۱۸ ہیں اور سطور ۱۵ ہیں۔

مقدمہ میں مفسر علام نے اس تفسیر کی اہمیت اور خصوصیت بتاتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ یہ مختصر ہونے کے باوجود دس ہزار فائدوں پر مشتمل ہے (اگرچہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی) حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں لکھا ہے:

"نجم الدین ابوالقاسم محمود بن ابوالحسن نیشاپوری قزوینی بیان الحق کی تفسیر ایجاز البیان فی معانی القرآن دس ہزار سے زیادہ فوائد پر مشتمل ہے جیسا کہ مصنف نے خود دیباچہ میں صراحت کی ہے، اس کی تحریر و تسوید سے ۵۵۳ھ میں فارغ ہوئے تھے"

نواب صدیق حسن خاں نے اپنی کتاب اکسیر فی اصول التفسیر میں کشف الظنون کے بیان کا اعادہ کیا ہے۔

مفسر مذکور نے اس تفسیر کے مقدمہ میں اپنی چند تصانیف کا ذکر کیا ہے جو سب کی سب فن تفسیر سے متعلق ہیں، لیکن ان کتابوں کا ذکر یا حوالہ نہ کسی کتاب میں ملتا ہے اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کسی کتاب کا کوئی نسخہ کہیں محفوظ ہے۔ کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ غرر الاقاویل فی معانی التنزیل ۲۔ کتاب باہر البرہان فی مشکلات القرآن ۳۔ کتاب الاسئلہ الرائعہ والاجوبۃ الصادعہ ۴۔ زبدۃ التفاسیر ولمعۃ الاقاویل ۵۔ جواہر الشواہد وقلائد القصائد ۶۔ حل الغرائب غالباً شرح ایجاز البیان

موخر الذکر کتاب کا ذکر مصنف نے اپنے مقدمہ تفسیر میں نہیں کیا ہے، لیکن الاعلام وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حل الغرائب علم حدیث کی کتاب ہے جسے مصنف نے "ایجاز البیان" سے فارغ ہونے کے بعد تصنیف کیا ہے اور غالباً اسی کتاب کو "کشف الظنون" میں "حل الغرائب" لکھا ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے یہ تفسیر نہایت مختصر اور ادق ہے، چنانچہ اس مخطوطہ پر کسی نے اپنا نوٹ اس طرح دیا ہے: "تفسیر ایجاز البیان اسمش با مسمے بسیار مطابق است" مصنف علامہ نیشاپوری است از علمائے متقدمین است عجب تفسیر غایۃ الایجاز دقیق بلکہ ادق املا فرمودہ" مختصر ہونے کے باوجود بمصداق قل و دل نہایت جامع اور نافع ہے گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

آغاز (ابتدا):- قال الشیخ الامام المفسر ابوالقاسم محمود ابن ابی الحسن النیشاپوری تغمدہ اللہ برحمتہ وانزلہ بحبوحۃ جنتہ وغفر لہ ولوالدیہ بعد حمد اللہ کما حقہ والصلوٰۃ علی نبیہ محمد خیر خلقہ فان افضل العلوم علم کتاب اللہ تعالیٰ النازل من عندہ الخ

اختتام:- الناس معطوف علی الوسواس لا غیر ای من شر الجن والانس واللہ اعلم بالحقیقۃ ترتیبہ۔ فرغ من تمنیق ھذا الکتاب العبد النحیف الضعیف المفتقر الی رحمۃ اللہ ربہ اللطیف عبداللہ بن محمد بن محمد الترمذی ضحوۃ الخمیس العشرین من جمادی الاخری سنہ ثمان وخمسین وست مائۃ۔ حامداً ومصلیا۔

یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے اس مخطوطہ پر کام

کرنے اور تعلیقات کے ساتھ اسے مرتب کرنے کا موقع ملا ہے اگرچہ ابھی تک تھوڑا
کام ہوا ہے اور حتی الامکان کوشش کی جا رہی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ مفید
بنایا جا سکے، چونکہ اس تفسیر کو مجھے بالاستیعاب غور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے
اس لیے اس کی خصوصیات نمبروار تحریر کرتا ہوں:

(۱) قرآن مجید کی یہ تفسیر علمی و فنی لحاظ سے بڑی نمایاں اور قابل قدر ہے ابتک
کی معلومات کے اعتبار سے یہ واحد قدیم نسخہ ہے۔

(۲) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے نہایت مختصر اور ادق ہے۔

(۳) مختصر ہونے کے باوجود بمصداق ما قل و دل نہایت جامع اور نافع ہے۔

(۴) تفسیر بیان کرتے وقت مفسر نے جس طرح اسباب نزول و شان نزول
کی طرف اشارہ کیا ہے اسی طرح علم کلام و عقائد کے نکات بھی اس میں ملتے ہیں اور
صرفی، نحوی اور لغت کے اشارات بھی موجود ہیں۔ اسرار و معارف کا بھی ذکر ہے
اور احادیث کے حوالے بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔

(۵) گو مفسر نے اس تفسیر میں علوم نقلیہ و احادیث ماثورہ کی روشنی میں بحث و گفتگو کی ہے
لیکن انکا طریقِ بیان اسطرح کا ہے کہ علوم عقلیہ سے بھی مطابقت پیدا ہو گئی ہے یعنی روایت کیساتھ
درایت بھی موجود ہے۔

(۶) مختلف تشریحات و بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفسر کا مسلک حنفی ہے لیکن
بعض مقامات پر تشریح حنفی مسلک کے مطابق نہیں ہے۔

(۷) اس تفسیر میں قرآن مجید کی ہر ہر آیت اور جملہ کی تفسیر نہیں ہے، بلکہ ضروری مشکل
اور قابل توضیح الفاظ یا جملوں اور آیتوں کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔

اس کتاب پر جو کام ہوا ہے وہ قسط وار "جرنل ادارہ عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک" میں شایع
ہو رہا ہے اہل علم سے تعاون کی درخواست ہے، اگر کسی صاحب کو اس تفسیر یا اسکے مرتب کے بارے میں
واقفیت اور مزید معلومات ہوں تو وہ راقم کو ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ اشاعت کے موقع پر ان سے فائدہ اٹھا سکوں۔

"اقبال کے فلسفیانہ افکار کا ارتقاء"

از ڈاکٹر آفاق فاخری

اقبال کے فلسفیانہ افکار میں مشرق و مغرب دونوں کے تصورات و نظریات
کا امتزاج ہے، ان کے ذہن و فکر کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مشرق و مغرب
کے سرچشموں سے پوری طرح سیراب ہوئے ہیں لیکن وہ ایک مفکرانہ اور فلسفیانہ ذہن و
دماغ کے حامل تھے، تحقیق و تجسس، تلاش و جستجو اور غور و فکر ان کی نمایاں خصوصیت تھی،
اس کے ثبوت کے لیے ان کے کلام اور خطوط کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

اقبال اوائل عمر سے لے کر اپنی زندگی کے آخر تک تلاش و جستجو کے مسلسل عمل کے
اسیر تھے، اسی لیے ان کے فکری ارتقاء میں متعدد جگہ تغیر و تبدل نظر آتا ہے کیونکہ
ان کے نزدیک فکر انسانی جامد و ساکت شے نہیں ہے بلکہ ہر ہر لحظ اس میں تبدیلیاں
ممکن ہیں۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کا غالب رجحان فلسفے کی جانب تھا۔ فلسفیانہ
نظریات اور تاریخ پر انہیں بڑا عبور تھا۔ فلسفہ اقبال کے متحرک شے ہونے ہی کی بنا پر انکے
کلام میں جمود و تعطل کے خلاف آواز سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے فلسفہ کو انسانی تعقل میں
حرارت بخشنے والا قرار دیا ہے۔ اپنی ڈائری میں تحریر کرتے ہیں۔

" فلسفہ انسان کی برفیلی رات میں کانپتا ہوا جوہر ہے، شاعر نمودار ہوتا ہے اور انکو
معروقیت کی حرارت بخش دیتا ہے۔"

اقبال ایسے فلسفے کے قائل تھے جو خون جگر سے لکھا گیا ہو۔ قوت، ایثار و قربانی اور جد و جہد سے خالی فلسفہ کو انھوں نے زندگی سے محروم قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اعلیٰ قسم کے فلسفہ کو انسانی معاشرے کے مسائل اور زندگی کے شب و روز سے ہم آہنگ ہونا چاہیے ؎

جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے　　یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار

اقبال کا فلسفہ ہمہ وقت آگے کی طرف رواں رہتا ہے۔ اس ارتقاء پذیری سے ان کے شعور کی پختگی اور بالیدگی کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ ان کے فلسفہ میں نظم و ارتباط کے باوجود ناقدین اقبال ان کے تشخص کے متعلق مختلف الرائے ہیں۔ کسی نے انہیں محض شاعر یا محض فلسفی اور کسی نے فلسفی شاعر (PHILOSOPHER POET) یا شاعر فلسفی (POET PHILOSOPHER) کہا ہے، خود اقبال کا بیان یہ ہے کہ ؎

خرد نے مجھکو عطا کی نظر حکیمانہ　　سکھائی عشق نے مجھکو حدیث رندانہ

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں　　پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اقبال کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے، لیکن ان کے شاعرانہ اور خطیبانہ لہجہ و آہنگ میں بھی فلسفہ کا انعکاس کافی نمایاں ہے۔ انکا کارنامہ یہ ہے کہ فلسفہ کے خشک موضوع اور منطقی استدلال کو شعر و سخن کے نازک قالب میں ڈھال دیا ہے جو ان کی عہد ساز اور دور بیں شخصیت کا کمال ہے، فن لطیف اور فلسفیانہ افکار کے انضمام میں ہی اقبال کی انفرادیت مضمر ہے۔ ان کے فلسفیانہ تفکرات میں لطیف خیالات اور بلندئ فکر کی آمیزش سے ایک غنائیت و موسیقیت نے

جنم لیا ہے جو صرف انہی کا حصہ ہے۔ اقبال کی شاعری میں بیک وقت فکر و فلسفہ اور مذہب تینوں چیزیں موجود ہیں، اسی لیے بعض ناقدین اقبال نے ان کے فلسفہ کو خالص اسلامی فلسفہ کہا ہے اور ان کے احساسات اور تخیلات کی اساس بھی اسلام کو ہی قرار دیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کے فلسفے اور فکر کا اعلیٰ مقصد اسلامی افکار کی ترویج اور اسلامی فلسفہ کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کرنا ہے۔ اقبال کے فلسفہ کو خوشخبری اور امید کا فلسفہ اور جد و جہد اور تحصیل مقاصد کا فلسفہ کہا گیا ہے۔[۳۲] اقبال نے خود اپنے انگریزی خطبات میں فلسفہ کی تعریف و تشریح کی ہے۔ ان کے پہلے خطبہ "علم اور روحانی حال و وجدان" سے فلسفہ کے متعلق ان کے خیالات و نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ فلسفہ کی آزادی کے اس حد تک قائل تھے کہ

"فلسفہ آزادانہ عقلی تجسس و تحقیق کا نام ہے وہ سند اور تقلید کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے، فکر انسانی اور عقائد دین میں بہت سی باتوں کو بے تنقید و تحقیق مسلمات میں داخل کر لیا جاتا ہے، فلسفہ ان مسلمات و معروضات کی تہہ تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے...... فلسفے کو بے شک یہ حق حاصل ہے کہ وہ دین پر ایک تنقیدی نظر ڈالے اور آزادانہ طور پر اس کو پرکھے۔"[۳۳]

اقبال نے مشرق و مغرب کا نہایت عمیق مطالعہ کیا ہے۔ مشرق کے علمی و ادبی خزانوں سے استفادہ کیا ہے اور مغرب کے حکیمانہ افکار نو کے ذخائر سے بھی خوشہ چینی کی ہے اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک فکری و فنی شاہراہ متعین کی اور متعدد ادبی شاہکار دنیا کے سامنے پیش کیے ہیں۔ اپنی شاعری میں حکمت اور فلسفہ کے خشک دقیق اور پیچیدہ مسائل کو شعر کا جامہ عطا کیا ہے۔ انھوں نے یونان و یورپ

مفکروں افلاطون، ارسطو، نیٹشے، کانٹ، ہیگل، برگساں، فشتے، مارکس اور لینن
وغیرہ سے لے کر مشرقی حکما ابن تیمیہ، رومی، غزالی، ابن سینا، فارابی اور ابن عربی
وغیرہ تک کے فکری اثاثوں کا نہ صرف بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے بلکہ ان پر اپنی
گرفت مضبوط رکھی ہے۔ ان میں سے بعض مفکرین نے مشرق و مغرب کو فکری اعتبار
سے یکساں طور پر متاثر کیا۔ اسی باعث مشرق و مغرب میں غیر مذہبی فکری رجحانات
کی دو الگ الگ سمتیں متعین ہوگئیں۔ اقبال نے اسی فکری اور مذہبی روایات کی میراث
سے کسب فیض کر کے اپنے فلسفیانہ ماحول کی تہذیب و ترتیب کی ہے، اس لحاظ سے انکو
مشرقی اور مغربی ادب کے بلند ترین افکار کا سچا وارث کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے
خود کو قدیم روایات کا اسیر نہیں بنایا اور یورپ کے ارتقاء اور عہد جدید کی مثبت
قدروں کی جانب سے اپنی آنکھیں بند نہ کیں بلکہ ان کو بھی اپنے فکری سرمایہ کا عنصر
تصور کیا، اس طرح انکی دوربین نگاہیں ماضی و حال سے گزر کر مستقبل پر بھی کمند
پھینکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اقبال نے اپنے عہد کی تحریکوں اور نظریات کے بھی اثرات قبول کیے لیکن
اندھی تقلید سے اپنے کو بچائے رکھا، جہاں وہ داغ، حالی، اکبر الٰہ آبادی سے
متاثر ہوئے ہیں وہیں غالب و بیدل کے اثرات کو بھی قبول کیا۔ ابن عربی، عرفی،
حافظ، سنائی سے اگر متاثر ہوئے تو رومی کو اپنا پیر و مرشد کہہ کر پکارا۔ رومی اور
ابن سینا کے فکری فاصلہ کو سمجھا اور دوسری جانب ہیگل، گوئٹے اور نٹشے کی
کاوشوں کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ غرض ان سب کے مجموعی اثرات اور
مشرقی و مغربی مفکروں کی فلسفیانہ میراث نے اقبال کی شخصیت و افکار کی

تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا ہے، اپنی ڈائری میں وہ تحریر کرتے ہیں۔

"مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، مرزا عبدالقادر
بیدل اور ورڈس ورتھ سے بہت کچھ لیا ہے۔ اول الذکر دونوں نے اشیاء
کے اندرون تک پہونچنے میں میری رہبری کی۔ تیسرے اور چوتھے نے مجھے
یہ سکھایا کہ شاعری کے غیر ملکی تصورات کو جذب کرنے کے بعد بھی جذبہ و
اظہار میں کیسے مشرقیت کو برقرار رکھا جاسکتا ہے اور موخرالذکر نے میری
طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچا لیا ہے"

فلسفیانہ شاعری محسوسات و مشاہدات کے بطن سے جنم لیتی ہے۔ اقبال کی
فلسفیانہ شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے محسوساتی حقائق و افکار جذبات و
وجدان سے لبریز ہیں، ان کی نگاہیں کائنات اور اس کے اثرات پر ایک فلسفیانہ
اور مفکرانہ اور عالمانہ زاویہ سے پڑتی ہیں، ان کی شاعری کو شعریت اور فلسفہ
کا سنگم کہا جاسکتا ہے، اقبال کے موضوعات میں فکر و فلسفہ، طبیعیات، مابعد الطبیعیات
مذہب و تمدن، تاریخ و عمرانیات اور فنون لطیفہ بھی شامل ہیں، ان کا سلسلۂ فکر
ایک نئے دستور حیات کا ضامن ہے، جس میں اجتہاد فکر و نظر نمایاں طور پر کار فرما
ہیں، اقبال کی فکر، مشرقی و مغربی افکار و تفلسف سے ہم آہنگ ہو کر اسلامی فلسفہ
یا اسلامی دستور حیات کو پیش کرتی ہے، ان کی شاعری کے فکری عناصر کی نشاندہی
پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اپنے انداز میں خوب کی ہے۔

"اگر ہم کلام اقبال کے فکری عناصر کی اجمال کے ساتھ نشاندہی کرنا چاہیں
تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں عشق، اثبات خودی، عمل، حرکت اور سخت کوشی کا

تصور، فقر و استغنا جو انسان کی روحانی اساس، مشینی نظام کے خلاف احتجاج اور فرد و جماعت کے مفادات کے درمیان توازن اور ہم آہنگی کی تلاش شامل ہے۔"[۵۶]

اقبال کے تصورات و تخیلات کا مرکز اور عزیز ترین موضوع "خودی" ہے، یہی اقبال کے فکر و فلسفہ کا نقطۂ ارتکاز اور محور ہے، بنیادی طور پر اس میں اسلامی معاملات زیر بحث آئے ہیں"، فلسفۂ خودی میں مرد مومن یا "انسان کامل" کی تصویریں نہایت واضح نظر آتی ہیں۔ ان سے انسان دوستی اور انسان سے ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال کا نظریۂ حیات متحرک اور زندہ اقدار کا حامل ہے، اس میں سکوت وجود نہیں ہے، اقبال کا فلسفۂ پیغام حیات کی نوید سناتا ہے، انہوں نے خودی کو دعوت دے کر بنی نوع انسان کو اپنے اندر پوشیدہ روحانی قوت کو عشق الٰہی کے ذریعہ نمودار کرنے پر زور دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ خودی انسان کا ازلی اور ابدی عنصر ہے، اقبال کا نظریۂ خودی، اسلامی نظریات سے ماخوذ ہے جس کا سرچشمہ قرآن مجید اور احادیث رسولؐ ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال اور فلسفۂ خودی کا تذکرہ اس انداز میں کیا ہے۔

"ان کے فلسفیانہ تفکر کا آغاز بھی خودی ہے، وسط بھی خودی اور انجام بھی خودی"[۵۷]

اقبال کے نزدیک خودی کے بغیر انسان اپنے اصل مرکز اور نصب العین سے دور ہو جاتا ہے۔ خودی اسے مادی اور روحانی ترقی کی اعلیٰ وارفع بلندیاں عطا کر کے کامیاب و کامران بناتی ہے، اسی باعث اقبال کا اصل فلسفہ، اسلامی فلسفہ

اخلاق میں مضمر نظر آتا ہے، چنانچہ "بال جبریل" کی مشہور مثنوی "ساقی نامہ" میں اقبال نے خودی کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے اس کی ماہیت اور عظمت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے ‏ ‏ ‏ خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات ‏ ‏ ‏ خودی کیا ہے، بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بد مست و خلوت پسند ‏ ‏ ‏ سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے ‏ ‏ ‏ نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
تری آگ اس خاکداں سے نہیں ‏ ‏ ‏ جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

فلسفۂ خودی پر ہی اقبال کے فلسفۂ حیات کی اساس ہے جو ان کے مربوط اور منضبط نظام فکر میں غالب ہے۔ تربیت خودی کے لیے انہوں نے اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی کے تین مراحل تجویز کیے ہیں۔ خودی کی نشوونما انسان کو ہر لحظہ انقلاب نو سے آشنا کرتی ہے۔ اسی سبب سے اسے انسانی زندگی کی آبرو کہا گیا ہے۔ وہ اس کائنات میں انسان کے اندر اپنی شناخت کا جذبہ پیدا کرتی ہے، ذات کا یقین و شعور ہی فلسفۂ خودی کا مقصود ہے اور شعور ذات اور شعور کائنات کے انضمام کو فلسفۂ خودی کا نام دیا گیا ہے۔ اسی شعور ذات اور شعور کائنات کو انفس و آفاق بھی کہا گیا ہے۔

اقبال کا فلسفۂ خودی قرآنی تعلیمات اور مذہبی تصورات پر مبنی ہے، انکی

شاعری میں حضور اکرمؐ سے جس قلبی اور والہانہ عقیدت کا اظہار ملتا ہے اس سے انکے روحانی اور وجدانی تفکرات کا اندازہ ہوتا ہے

اقبال نے خودی کی توسیع و بقا اور اس کے ارتقاء و استحکام کے لیے عشق، سعی پیہم، فقر و استغنا کو ضروری قرار دیا ہے اس کی تکمیل اور اس کے اندر حرارت اور بیداری اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب عشق اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو، خودی اور عشق دونوں لازم و ملزوم ہیں، خودی کے استحکام میں عشق ہی سب سے بڑا معاون ہے اور عقل اس کے راستے میں مزاحم ہے، بعض مغربی مفکرین کے نزدیک اقبال عقل کو محدود اور عشق کو لامحدود قرار دیتے ہیں۔ عقل و عشق کی اسی کشمکش میں وہ ایک بار گرفتار ہو کر اس کا فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کس کو ترجیح دی جائے وہ کبھی رازی کے فلسفۂ عقل و خرد اور کبھی رومی کے سوز و ساز کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی کشمکش میں وہ ہیگل کی جانب مائل ہوئے مگر وہاں ان کی فکر میں اور بھی الجھاؤ پیدا ہو گیا لیکن چونکہ اقبال ایک فلسفیانہ ذہن و دماغ بھی رکھتے تھے اسلیے وہ جلد ہی مطمئن ہو گئے، ڈاکٹر عبدالحکیم نے "فکر اقبال" میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"اقبال خود فلسفی بھی ہے اور شاعر بھی، اس کی طبیعت میں بو علی اور رازی کا انداز بھی ہے اور رومی کا سوز و ساز بھی، اسی آمیزش نے اس کے کلام کو الہامی بنا دیا ہے"

اقبال نے عقل اور عشق کے ان معاملات میں امام غزالی سے بھی رہنمائی حاصل کی ہے اور ان کی اس ذہنی و فکری کشمکش کا خاتمہ کچھ اس انداز سے ہوا۔

ع جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

عقل و خرد کے متعلق انھوں نے اپنی شاعری میں متعدد جگہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے ان کے عقلی نظریات کی وضاحت ہوتی ہے مثلاً ؎

خودی نے مجھ کو عطا کی نظرِ حکیمانہ — سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں — ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال نے ہمیشہ عشق کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اس کی سادگی اور جذبات مندی کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ اس میں سچائی ہے اور عقل فریب و مصلحت کا نام ہے جو انسان کے ذوقِ عمل کو کمزور کر دیتی ہے۔

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی — خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گونا گوں

اقبال نے خودی کے استحکام و بقاء کے لیے جہدِ مسلسل کو لازمی قرار دیا ہے۔ بعض ناقدین اقبال نطشے "فوق البشر" کو اقبال کے "مردِ کامل" کا مماثل ٹھہراتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہ خلافِ واقعہ ہے۔ اقبال کی فکری اساس احکامِ خداوندی پر ہے اور نطشے کے یہاں خدا کا تصور ہی نہیں، وہ وجودِ خدا کا منکر ہے۔ اپنے فوق البشر کی زندگی کے لیے نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا ہے۔

اقبال کی شاعری میں حرکت اور تجدید کا ظہور نہایت نمایاں ہے، ان کی فکر میں برگساں اور نطشے کے تصورات کا عکس ملتا ہے مگر اقبال نے زمانے کی دو قسمیں بتائی ہیں اول زمانِ مسلسل یعنی وہ زمانہ جس کے شب و روز کو تقسیم کیا گیا ہو اور جو گردشِ رفتار کا مرہونِ منت ہو، دوسرا وہ زمانہ ہے جس میں شب و روز کی تقسیم ممکن نہیں، جس کا خارجی وجود نہیں، جس میں غروب و طلوع کا کوئی مسئلہ نہیں، جو ماضی اور مستقبل کی قید سے آزاد اور صرف زمانِ حال کا نام ہے، ایسے زمانے کو زمانِ خالص یا زمانِ حقیقی

کہا گیا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہی حال ہی حیات دوام ہے۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا؟ ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

انسان کی زمان و مکان سے آزادی کو اقبال نے عین منشائے الٰہی اور مقصدِ حیات قرار دیا ہے، تسخیرِ فطرت ہی آدمی کا اصل مقصد ہے، زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر انسان کائنات کو مسخر کر سکتا ہے لیکن عقل و خرد ان ساری صلاحیتوں کو سلب کر دیتی ہے ؎

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

وقت ایک مجرد تصور ہے۔ اقبال نے اس کو ایک حقیقت تصور کیا ہے، اسی باعث جب وہ سلسلۂ روز و شب کا ذکر کرتے ہیں تو اسے اصل حیات و ممات قرار دیتے ہیں، اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وقت اعتباری شے نہیں بلکہ حقیقی شے ہے، زمان و مکان یا وقت کے متعلق اقبال کا یہ نقطۂ نظر ان کی مشہور نظم "مسجد قرطبہ" میں موجود ہے ؎

سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ کائنات سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا؟ ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اقبال کے فلسفیانہ افکار کے ارتقائی مراحل کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جرمن شاعر گوئٹے نے ان کو زیادہ متاثر کیا ہے، اسی باعث ان دونوں میں کافی مماثلت ہے، گوئٹے کو اقبال نے "حکیم حیات" کا خطاب دیا ہے، مگر اس کے باوجود انھوں نے

اسلامی روایات و احکام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے، دراصل وہ مشرقی اور مغربی فلسفہ کے انہیں اثرات کو قبول کرتے ہیں جو اسلامی تصورات سے ہم آہنگ ہیں، وہ کسی بھی مکتب فکر کے تصورات و خیالات کو خوب پرکھنے کے بعد ہی مانتے ہیں، ان کا فلسفہ کسی مفکر یا حکیم کے نظریے سے ماخوذ نہیں ہے، وہ اصلاً اسلامی فلسفہ کے قائل تھے اور اسے ہی انہوں نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب نے ان جواہر پاروں پر بھی اندھا دھند ہاتھ نہیں مارا ہے بلکہ ان میں تصرفات اور اضافے بھی کیے ہیں۔ اس لیے جہاں تک افکار کا تعلق ہے انہوں نے نہ رومی کا کامل تتبع کیا ہے نہ نٹشے کا نہ برگساں کا اور کارل مارکس کا اور نہ لینن کا۔"[۸]

حوالہ جات

۱۔ بحوالہ بکھرے خیالات: مترجم ڈاکٹر عبدالحق، جمال پریس جامع مسجد دہلی ۱۹۷۵ء ص ۱۰۱
۲۔ فکر اقبال: خلیفہ عبدالحکیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۷ء ص ۴۴۵
۳۔ اقبال معاصرین کی نظر میں: مرتبہ وقار عظیم ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۲ء ص ۲۵۰
۴۔ بحوالہ بکھرے خیالات: مترجم ڈاکٹر عبدالحق، جمال پریس جامع مسجد دہلی ۱۹۷۵ء ص ۳
۵۔ نقش اقبال: پروفیسر اسلوب احمد انصاری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۹ء ص ۳۴
۶۔ فکر اقبال: خلیفہ عبدالحکیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۷ء ص ۳۳۴
۷۔ ایضاً ص ۲۱۲ ۸۔ اقبال کامل: مولانا عبدالسلام ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۶۴ء ص ۳۱۹۔

وفیات

پروفیسر نورالحسن کی رحلت

ملک کے مشہور مورخ و عالم اور مغربی بنگال کے گورنر پروفیسر نورالحسن کی طبیعت عرصہ سے خراب تھی، وہ علاج کے لیے امریکہ جانے والے تھے کہ مرض میں شدت ہوگئی، اور ۱۶؍جون کو ایس۔ ایس۔ کے۔ ایم اسپتال کلکتہ میں داخل ہوئے جہاں ۱۲؍جولائی کو ۷۲ سال کی عمر میں رحلت فرماگئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

پروفیسر نورالحسن کا دادھیال اور ننھیال کو علمی، تعلیمی اور دنیاوی حیثیت سے بڑی وجاہت حاصل تھی، ان کا اصل آبائی وطن فیض آباد تھا، ان کے والد عبدالحسن مرحوم وہاں کے ڈپٹی کلکٹر بھی تھے، حسن خدمت کی بناپر برطانوی حکومت نے ان کو خان بہادر کا خطاب دیا۔ وہ صوبائی سکریٹریٹ کے مختلف شعبوں میں جوائنٹ سکریٹری بھی رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد ریاست رام پور میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے، پھر شیعہ سنٹرل وقف بورڈ اترپردیش کے صدر مقرر ہوئے۔ نورالحسن مرحوم کا ننھیال جونپور میں تھا وہ سروزیر حسن کے نواسے اور سید علی ظہیر اور سید سجاد ظہیر وغیرہ کے حقیقی بھانجے تھے، بعد میں ننھیالی اور دادھیالی عزیز لکھنؤ میں متوطن ہوگئے، یہیں ۲۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کو نورالحسن صاحب پیدا ہوئے تھے۔

ان کی تعلیم الہ آباد میں ہوئی، طالب علمی کے زمانے ہی سے تقریر میں وہ اپنا جوہر دکھلانے لگے تھے، اکثر تقریری مقابلوں میں انہیں فرسٹ پرائز ملتی۔ بعد میں وہ بہت اچھے مقرر ہوئے، وہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ممبر اور الہ آباد یونیورسٹی یونین کے سکریٹری بھی رہے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ گئے، ان کا خاص موضوع تاریخ تھا جس کے وہ ماہر و محقق تھے، ۱۹۵۰ء میں آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

مرحوم کی علمی زندگی کا آغاز درس و تدریس سے ہوا، پہلے وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے پھر علی گڑھ اور دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ سائنس اور صنعتی ریسرچ کی کونسل کے نائب صدر بھی رہے۔ جس کی صدر مسز اندرا گاندھی تھیں۔ کونسل کی جانب سے کئی بین الاقوامی سمینار ہوئے جس میں اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا کہ ہندوستان میں ۱۲۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک سائنس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

پروفیسر صاحب کی علمی لیاقت کی طرح انتظامی صلاحیت، حب الوطنی اور سیکولر پسندی بھی مسلم تھی، اس لیے حکومت کی نظر بھی انکی جانب اٹھی۔ وہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے، ۱۹۷۲ء میں تعلیم، سماجی بہبود و ثقافت کے مرکزی وزیر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۷ء تک اس منصب پر فائز رہے، اس کے بعد تین سال تک سابق سوویت یونین میں ہندوستان کے سفیر رہے، ان کی کوششوں سے دونوں ملکوں کے تعلقات مزید استوار ہوئے اور اس عرصہ میں انہوں نے روسی جمہوری ریاستوں خاص طور پر مسلم ایشیائی ریاستوں کا دورہ کیا، دو مرتبہ ہندوستانی وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اپنے ملک کی نمائندگی کی اور یونسکو کی جنرل کانفرنسوں میں انہیں ہندوستانی

وفد کی قیادت کرنے کا موقع بھی ملا۔ آخر میں وہ مغربی بنگال کے گورنر مقرر کیے گئے اور اس حیثیت سے بہت مقبول اور نیک نام رہے، اس منصب پر دو مرتبہ فائز کیے گئے، پہلے ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک اور دوبارہ ۱۹۹۰ء میں پھر مغربی بنگال کے گورنر ہوئے اور مرنے کے بعد ہی اس سے سبکدوش ہوئے، درمیان میں تھوڑی مدت کے لیے اڑیسہ کے گورنر بنائے گئے مگر ان کا دل کلکتہ ہی میں اٹکا ہوا تھا اور غالب کی طرح انکی رگ و پے میں بھی اس کی محبت سرایت کیے ہوئے تھی۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں ‏ ‏ ‏ ‏ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

ریاستی اور مرکزی حکومتوں سے ان کے تعلقات اچھے تھے اور انہوں نے ان کو ٹکراؤ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جس کا اعتراف مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ مسٹر جیوتی باسو نے ان لفظوں میں کیا ہے:۔

"وہ گورنر اور متعدد یونیورسٹیوں کے چانسلر کی حیثیت سے ہمارے لیے ایک دانش مند مشیر تھے۔"

وہ ریاست کے عوام میں گھل مل گئے تھے اور ان سے بڑی محبت کرتے تھے، عوام کے ہر طبقہ میں انہیں پسند کیا جاتا تھا، ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے مسائل اور خاص طور پر اپنی ریاست کی تعمیر و ترقی اور خوش حالی سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔

نورالحسن مرحوم کا میلان شروع میں کمیونزم کی جانب ہوگیا تھا، اس میں اسکا بھی اثر رہا ہوگا کہ وہ طالب علمی ہی کے زمانے میں جواہر لال نہرو کے گھر برابر جاتے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے جب ان کا تعلق ہوا تو کمیونسٹ تحریک سے وابستہ متعدد اشخاص وہاں موجود تھے جن میں ان کے ماموں سجاد ظہیر بھی تھے۔ اس زمانے میں

یہاں سے ایک اخبار نکلتا تھا جس کی حیثیت کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان کی تھی۔ اپنی عالی نسبی اور خاندانی امارت کے باوجود پارٹی سے ان کے اخلاص و تعلق کا یہ حال تھا کہ اخبار کی کاپیاں سائیکل کے ہینڈل پر رکھ کر فروخت کرتے تھے۔

عرصہ تک اس تحریک سے وابستہ رہنے کے باوجود خاندانی شرافت و وضعداری گھر کی تربیت اور ماحول کے اثر سے ان میں مسلمان گھرانوں کی روایات اور اودھ کی تہذیب و شائستگی کی خوبو ہمیشہ باقی رہی اور وہ اشتراکیت کو سیکولرازم اور رواداری کے قریب لانے کا کام بھی کرتے رہے اور آخر میں تو انہوں نے اس سے پوری طرح چھٹکارا پا ہی لیا تھا گویا ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

کلکتہ کے جسٹس خواجہ محمد یوسف ۲۲ جون کو ان کی عیادت کے لیے اسپتال گئے تو ان سے تنہائی میں فرمایا کہ میں آپ کو اپنا گواہ مقرر کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ میری طرف سے شہادت دے سکیں، میرے متعلق بہت سی باتیں اڑائی گئی ہیں کہ میں بدعقیدہ ہوں، یہ جھوٹ ہے، میں مسلم گھرانے میں پیدا ہوا، ہمیشہ مسلمان رہا، آج بھی مسلمان ہوں، اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان ہے اور انشاء اللہ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہوں گا، اس کے بعد انہوں نے بآواز بلند کلمۂ شہادت پڑھا اور پھر خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ گواہ رہیں (آزاد ہند کلکتہ)

اردو زبان سے ان کو سچا عشق تھا، وہ اسی تہذیب کے پروردہ تھے، ملک میں اردو کا رواج کم ہونے سے بھی کڑھتے رہتے تھے، ان کے نزدیک یہ کسی خاص فرقہ و مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ ملک کی قدیم تہذیب و ثقافت سے جڑا ہوا ہے، اس لیے اردو کا خاتمہ دراصل اس مشترکہ تہذیب و ثقافت کا خاتمہ ہے۔

طلبہ کی موجودہ بے راہ روی اور بدعنوانی بھی ان کے اضطراب کا باعث بنی ہوئی تھی، وہ موجودہ نظام تعلیم کی خرابیوں سے واقف تھے مگر اپنی مجبوری و بے بسی کو بھی سمجھتے تھے، اردو ہی نہیں فارسی کی تعلیم کو وہ اسی لیے ضروری خیال کرتے تھے کہ اسکے بغیر طلبہ میں شرافت، شائستگی، بھلمنساہت، انسان دوستی اور اخلاقی اقدار پیدا نہیں ہو سکتیں، ایک مرتبہ ایک طالب علم کو خاص طور پر تاکید کی کہ "بیٹا فارسی ضرور پڑھنا کیونکہ فارسی پڑھے بغیر اخلاق نہیں آسکتا اور اخلاق ہی زندگی کا جوہر ہے"۔ اسی لیے علمی و تعلیمی مجلسوں اور اردو اداروں کی تقریبات میں معذوری اور علالت کے باوجود شریک ہونے کی کوشش کرتے اور بڑی مناسب اور برمحل تقریریں کرتے، اس طرح کی تقریبوں میں وہ کارکنوں کی ہمت افزائی بھی فرماتے اور ان کی توجہ ان گوشوں کی جانب مبذول کراتے جن کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

ان میں قوم و ملت کا درد تھا اس لیے ان کی زبوں حالی پر بے چین رہتے تھے خاص طور پر مسلمانوں کی علمی و اقتصادی پس ماندگی اور ان کے موجودہ ابتر حالات کا انہیں ملال رہتا تھا، وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ملک کے دوسرے طبقوں کے دوش بدوش اپنے وطن کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں حصہ لینا چاہیے اور وہ جس منصب پر فائز ہوں اسے محنت اور ذمہ داری سے انجام دیں تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ مسلمان بڑے عہدوں کے اہل نہیں ہیں، ملک میں سیاست اور اخلاق کے گرتے ہوئے معیار سے وہ بہت زیادہ کبیدہ خاطر رہتے تھے، موجودہ سیاست کو وہ کوئلے کی دوکان کہتے تھے کہ جو اس میں گیا اس کے کالک لگ گئی، انہوں نے اپنے کو اس کی آلودگی سے بچائے رکھنے کی پوری کوشش کی۔

پروفیسر نورالحسن مرحوم ایک باغ و بہار، خوش مزاج، خوش گفتار اور خوش اخلاق شخص تھے۔ ہر شخص کے لیے ان کے دل میں شفقت و محبت کا جذبہ موجزن رہتا تھا، اپنے عمدہ برتاؤ اور اچھے سلوک سے وہ لوگوں کا دل جیت لیتے تھے اور کبھی کسی کو کسی طرح کی شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے، ان میں عجب و غرور اور خود نمائی نہ تھی، سچائی، خلوص، ایمانداری، حقیقت پسندی اور غیر جانبداری کو اپنا وطیرہ بنا لیا تھا، وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے، اگر انہیں کسی سے اختلاف بھی ہوتا تو اس پر نہ ناگواری ظاہر کرتے اور نہ اس سے اپنی بات زبردستی منواتے، لیکن اپنی رائے وثوق و اعتماد سے ضرور بیان کر دیتے، لوگوں کی خوبیوں کی جہاں داد دیتے وہاں ان کی غلطیوں کی جانب بھی مناسب انداز میں اس کو متوجہ کر دیتے، ہر شخص سے نباہ کر لینے کا سلیقہ انہیں معلوم تھا، بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے عزیزوں، اہل تعلق اور پڑوسیوں کو ہمیشہ یاد رکھا جن میں امیر و غریب دونوں طرح کے لوگ ہوتے تھے، دراصل وہ بڑے شائستہ، وضعدار اور ملنسار شخص تھے اور ان کی زندگی لکھنوی نفاست و شرافت اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ تھی۔

مہمان نوازی میں ان کو لطف ملتا تھا، گورنر ہاؤس میں اکثر پر تکلف دعوتیں کرتے، رمضان میں بالالتزام افطار پر لوگوں کو مدعو کرتے، گورنر ہاؤس کی بالائی منزل پر مغرب کی اذان و نماز کا اہتمام ہوتا، افطار میں وہاں کے مسلم ملازمین بھی سب کے ساتھ افطار کرتے، عیدالاضحیٰ کے دن خاص احباب کو قربانی کا گوشت بھجواتے، خود بھی کھانے کے شوقین تھے، ان کا خاص باورچی لکھنؤ کا تھا، کھانے کے انواع و اقسام

کے بارے میں ان کے معلومات وسیع تھے۔

ان میں عصبیت، تنگ نظری اور جانبداری نہ تھی، مسلمانوں کے اختلاف، تحزب اور فرقہ آرائی کو ناپسند کرتے تھے، خود شیعہ تھے لیکن سنیوں اور غیر مسلموں سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے اور سب کا احترام کرتے تھے۔ اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی سنیوں سے کی تھی۔

وہ ایک بڑے عالم اور اہل علم کے قدرداں تھے، ان کی تحقیق اور تلاش و جستجو اور علم کی طلب و تحصیل کا سلسلہ آخر دم تک قائم رہا، وہ ہمیشہ اپنے کو طالب علم ہی سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہی آدمی عالم ہے جو طلب علم میں مصروف رہے، انکی مجلس اہل علم و اصحاب کمال سے معمور ہوتی تھی، ان کی دعوتوں میں ان لوگوں کی موجودگی ضروری تھی۔ علم سے ان کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ جب روس کے سفیر ہوئے تو مسلم ایشیائی ریاستوں کا دورہ کیا اور وہاں کے کتب خانے کنگھالے، عہد وسطیٰ کے فارسی مسودوں کا بغور مطالعہ کیا اور اپنے ساتھ ان کی فوٹو کاپیاں لائے، بعض کو ایڈٹ کرکے شایع بھی کرنا چاہتے تھے مگر سرکاری مشغولیتوں کی وجہ سے اس کا موقع نہیں ملا۔

صحت کی خرابی کے باوجود علمی پروگرام میں حصہ لیتے، ایران سوسایٹی کے سرپرست تھے، اس کی تقریبات میں موجود رہتے، ایشیاٹک سوسائٹی کو بہتر بنانے میں بھی دلچسپی لی، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے خاص عقیدت تھی، مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کے قیام کا سہرا انہی کے سر بندھتا ہے۔

موجودہ قحط الرجال میں ایسے عالم، مدبر اور منتظم شخص کا اٹھ جانا ایک قومی نقصان

ہے، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور ان کے ساتھ رحم و شفقت کا معاملہ کرے۔

آہ! ڈاکٹر محمد معظم جیراجپوری

دارالمصنفین کی مجلس عاملہ و انتظامیہ کے رکن ڈاکٹر محمد معظم جیراجپوری بھی ۱۴ جولائی کو دہلی میں انتقال کر گئے اور وہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

ان کا وطن اعظم گڈھ کا معروف گاؤں جیراج پور ہے، یہیں ۱۹۲۰ء میں وہ پیدا ہوئے تھے، ان کا خاندان علمی، تعلیمی اور دینی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے دادا مولانا سلامت اللہ جیراجپوری مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، وہ نواب صدیق حسن خاں کی دعوت پر بھوپال تشریف لے گئے اور ریاست کے مدارس کے اہتمام کی خدمت پر مامور ہوئے، وہ جمعیۃ اہل حدیث کے سرخیل تھے ان کے اثر سے اعظم گڈھ میں اس مسلک کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ ڈاکٹر محمد معظم کے والد مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری انہی کے لائق فرزند اور ملک کے مشہور عالم و مصنف تھے جو مدۃ العمر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تاریخ اسلام و دینیات کے استاد رہے، ڈاکٹر محمد معظم کی تعلیم بھی جامعہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے طب کی تحصیل کی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے اعظم گڈھ میں اپنا مطب کھولا۔ اپنی اصول پسندی محنت، پیشہ میں یکسوئی و انہماک اور مریضوں کے علاج میں نہایت دلسوزی کی وجہ سے بہت جلد کامیابی نے ان کے قدم چومے اور وہ پورے ضلع میں ایک اچھے معالج کی حیثیت سے مشہور ہو گئے، صبح و شام کو مریضوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔

علم، ادب اور شعر و سخن سے دلچسپی کی بنا پر شام کے وقت ان کے مطب میں ادیب و شاعر، شبلی کالج کے اساتذہ اور دارالمصنفین کے رفقاء کی نشست ہوا کرتی تھی، بڑے باغ و بہار آدمی تھے اپنی دلچسپ اور پُر لطف باتوں سے مجلس کو زعفران زار بنا دیتے تھے، خود بھی شعر کہتے تھے اور اعظم گڈھ کی نشستوں میں پابندی سے شریک ہوکر اپنا کلام بھی سناتے تھے۔

شروع ہی سے دارالمصنفین سے ان کا ربط و ضبط تھا، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے ان کے گہرے تعلقات تھے، راقم سے عزیز داری کا تعلق تھا اس لیے بڑی شفقت فرماتے تھے اور جب بھی ملاقات ہوتی تو دارالمصنفین ہی کے بارے میں گفتگو کرتے اور اس کی مشکلات کے حل کی صورتیں بتاتے۔

چند برس قبل قلبی دورہ پڑا جس کے بعد صحت میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا تھا، بالآخر وقت موعود آگیا، ادھر سال ڈیڑھ سال سے برابر دہلی ہی میں اپنی صاحبزادی کے پاس رہتے تھے، ان کی اہلیہ کا انتقال بہت پہلے ہوگیا تھا۔ ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر محمد شمیم جیراجپوری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زوالوجی کے شعبہ کے صدر ہیں وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے زوالوجیکل سروے آف انڈیا کے ایڈوائزر بھی رہے اور اپنے فن میں ماہر ہونے کی بنا پر یورپ کے ملکوں میں بھی ان کی شہرت ہے، چھوٹے صاحبزادے محمد سلیم جیراجپوری اعظم گڈھ کے ایک بڑے ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر محمد معظم کی زندگی خدمت خلق میں بسر ہوئی، وہ صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند تھے، اللہ تعالیٰ انکو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کے غم کو زائل کرے آمین

"ض"

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

تحقیق مدیر ڈاکٹر نجم الاسلام، صفحات ۴۵۰، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، پتہ: شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، نیو کیمپس، جام شورو، قیمت ساٹھ روپیے۔

یہ شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی کا سالنامہ ہے جس کے پانچ شمارے اب تک شایع ہوچکے ہیں، متنوع مضامین پر مشتمل ہے، سندھ و مکران کی سیاسی و ثقافتی تاریخ کے چند ماٰخذ (ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ) میں قاسم داؤد کے ترجمہ عوارف المعارف اور دوسری منظوم و منثور کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو قابل مطالعہ ہے، حضرت مظہر جانجاناں کے خلیفہ مولوی نعیم اللہ بہرائچی کی خانقاہ میں دستیاب خطوط اور ان کے متعلق ضروری معلومات شایع کیے گئے ہیں، پھر ایک مضمون میں قدرت اللہ قدرت کے حالات و شاعرانہ کمالات پر گفتگو کی گئی ہے، ہندی ادب کی اصناف نظم بارہ ماسہ و تیرہ ماسہ کے ضمن میں منشی الٰہی بخش کی بکٹ کہانی اور طالب شاہ کی مثنوی انوار العاشقین میں درج صوفیانہ نقطہ نظر کا جائزہ لیا گیا ہے، اس شمارہ کا ایک دلچسپ مقالہ تذکرہ مخزن الغرائب و انیس العاشقین (مظہر محمود شیرانی) ہے جس میں ایک قدیم ادبی معرکہ کی داستان بیان کی گئی ہے، جس میں ضمناً حافظ محمود خاں شیرانی کے ایک غیر مطبوعہ مضمون کا عکس دیا ہے، عبدالحق ونگیسنہ پروین کے مضمون میں خاص سائنٹفک انداز میں مذہب اور امن و آشتی کو بالکل ہم آہنگ بتایا گیا ہے، خواجہ حسن نظامی کے سفرنامۂ ہندوستان اور سندھی ادبی بورڈ کے مخطوطات کی فہرست نے اس شمارہ کو مزید معیاری

اور قابل قدر بنا دیا ہے، یہ مجموعہ اہل علم کے لیے ایک علمی سوغات ہے۔

مجلہ ترجمان الاسلام (مولانا حبیب الرحمن اعظمی نمبر) مدیر: اسیر ادروی

صفحات ۳۰۳، کاغذ غنیمت، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: شعبۂ نشر و اشاعت، جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب، بنارس۔

مولانا حبیب الرحمن اعظمی موجودہ دور کے نامور عالم و محدث تھے، ترجمان الاسلام نے ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر شایع کیا ہے اور یہ مولانا کے حالات اور کارناموں کا مرقع ہے، اس کی ابتدا حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے تاثرات سے کی گئی ہے، اس نمبر کا بڑا مفید اور قیمتی مضمون مسند احمد بن حنبل کی تحقیق (مولانا اعجاز احمد اعظمی) ہے، اس میں مشہور مصری علامہ احمد محمود شاکر پر مولانا کے نقد و تعاقب کا جائزہ لیا گیا ہے، مصنف عبدالرزاق (اسیر ادروی) میں مولانا حبیب الرحمن اعظمی اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے درمیان ہونے والے ایک دلچسپ علمی مباحثہ کا ذکر ہے، نقوش و تاثرات (مولانا ظفیر الدین) میں مولانا اعظمی کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے تاثرات تحریر کیے گئے ہیں، اس ضمن میں ان بزرگوں سے مولانا کے تعلق کا ذکر بھی آگیا ہے، مولانا کی وفات کے بعد معارف اور دوسرے رسالوں میں ان کے تعلق سے جو تاثراتی مضامین شایع ہوئے ہیں ان کو بھی نقل کیا گیا ہے، مولانا محمد حنیف ملی کے مضمون میں جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے امارت شرعیہ کے قیام اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے اس کے امیر الہند منتخب کیے جانے کا تذکرہ جس انداز سے کیا گیا ہے وہ نامناسب ہے، ص ۲۲۳ اور ص ۲۲۸ کے درمیانی صفحات غائب ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر اچھا ہے، جس کی

ترتیب و اشاعت پر لائق مرتب ستایش کے مستحق ہیں۔

ماہنامہ دارالعلوم الاحسان نمبر ایڈیٹر مولانا حبیب الرحمن قاسمی

صفحات ۲۴۰، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت ۴۵ روپیے، پتہ: دارالعلوم دیوبند، ضلع سہارنپور۔

دارالعلوم ہندوستان اور ایشیا کی مشہور مذہبی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کا ترجمان ہے، اس سے پہلے اس نے بابری مسجد پر بھی ایک خاص نمبر شایع کیا تھا جو بہت مقبول ہوا، اس خاص نمبر میں احسان پر ممتاز اصحاب علم کے مقالات شامل کیے گئے ہیں، احسان کی تعبیر اب تصوف کے لفظ سے کی جاتی ہے، اس نمبر کے اجرا کا مقصد تصوف پر کیے جانے والے ناروا اعتراضات کا ازالہ ہے، پہلے مقالہ میں اکابر دیوبند بالخصوص مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حوالوں سے بعض مصطلحات تصوف کا عمدہ تعارف ہے، سلفی تصوف کے عنوان سے علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن القیمؒ کو بھی تصوف کا ہمنوا بتایا گیا ہے، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے احسان و سلوک کے ذکر میں بھی ایک عقیدت مندانہ مقالہ شامل اشاعت ہے، اخیر کے دو مقالے صوفیہ کے تذکروں پر مشتمل ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا مقالہ "تصوف اور صوفیہ کا مقصد حیات" مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور پر مغز ہے، مجموعی طور پر یہ خاص نمبر اچھا اور مفید ہے، لیکن اس کی بھی ضرورت تھی کہ اس کے مقالوں میں مدلل گفتگو کی جاتی تاکہ کتاب و سنت سے بھی تصوف کی مطابقت اور ہم آہنگی پورے طور پر واضح ہو جاتی اور محض اشخاص و افراد کے حوالوں پر اکتفا نہ کیا جاتا۔ اس سلسلہ میں جماعت دیوبند کے سرخیل اور مشہور عارف باللہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو تحقیقی اور تجدیدی کام انجام دیا ہے

اس کو پیش کرنا زیادہ مفید ہوتا۔

ماہنامہ محدث، صحافت کانفرنس نمبر مرتبہ جناب عبدالوہاب حجازی، صفحات ۱۲۰، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸ روپیے، پتہ ادارۃ التالیف والترجمہ بی ۱/۱۸ ریوڑی تالاب، وارانسی۔

جامعہ سلفیہ بنارس جمعیۃ اہل حدیث کی بڑی اور مرکزی درسگاہ ہے اس کے زیر اہتمام کانفرنس اور سیمینار بھی برابر ہوتے رہتے ہیں، گذشتہ سال نومبر میں وہاں ایک دو روزہ صحافت کانفرنس ہوئی تھی، جامعہ کے اردو ترجمان محدث نے اپنے اس خاص شمارہ میں کانفرنس کی روداد شایع کی ہے، مقالات، تجاویز اور کانفرنس سے متعلق اخبار اور رسالوں کے تاثرات شایع کیے ہیں۔

نخلستان، کل ہند اردو کنونشن نمبر ایڈیٹر مختار الرحمٰن راہی، صفحات ۲۵۵، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، قیمت دس روپیے، پتہ: راجستھان اردو اکیڈمی، جے پور۔

راجستھان اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ۳ تا ۵ جنوری ۹۲ء کو ایک کل ہند اردو کنونشن ہوا تھا، اسکے افتتاحی اجلاس کے بعد مقالات کی تین نشستیں ہوئیں، اب اکیڈمی کے سہ ماہی مجلہ نے اسکی روداد شایع کی ہے، کنونشن کا بنیادی مقصد ہندوستان کے جمہوری اور سیکولر آئین کی روشنی میں زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے مسائل پر غور و خوض تھا، اس میں تصوف اور بھگتی تحریک کے احیاء پر بھی خاص زور دیا گیا، کنونشن میں اردو ہندی اور ملک کی علاقائی زبانوں کے ارتباط پر بھی مقالے پڑھے گئے اور تکنیکی دور سے اردو کو ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا، اس میں کنونشن کے موقع کی تصویریں بھی شایع کی گئی ہیں اور راجستھان اردو اکیڈمی کے ممبران کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔

ع۔ع۔

مطبوعات جدیدہ

انشائے ماجد یا لطائف ادب از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۵۰۶، قیمت ۱۵۰ روپیے، پتہ: ادارہ انشاعت ماجدی ۱۴۲/۱۲ ہند سرائی کلکتہ ۴۳۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے چند ادبی مقالات و فکریات اور منتخب مقدموں اور تبصروں اور تعزیتی مضامین کے دو مجموعے انشائے ماجد کے نام سے عرصہ ہوا لکھنؤ سے شایع ہوئے تھے، اب ادب اور انشا کے ان شہ پاروں کو زیر نظر کتاب میں مزید چار مضامین کے اضافہ کے ساتھ یکجا کرکے شایع کیا گیا ہے، جن مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے ان میں دار المصنفین کی گولڈن جبلی کے موقع پر پڑھا جانے والا علامہ شبلیؒ پر ان کا مشہور مضمون "شبلیؒ، انسان، مصنف، مصنف گر" اور خود جبلی سے متعلق صدق میں شایع شدہ ان کا ایک مضمون بھی شامل ہے، "لطائف ادب" کے اضافی نام کے ساتھ اس طبع جدید کی سب سے بڑی خوبی اس کی نہایت اعلیٰ طباعت قیمتی کاغذ، نفیس جلد اور خوبصورت اور پُرمعنی گرد پوش ہے، ادارہ اشاعت ماجدی کی مطبوعات خوب سے خوب تر کی جستجو کی بہترین مثال ہیں، انشائے ماجدی کے شیدائیوں کے لیے اس سے بہتر تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

اردو سندھی کے لسانی روابط از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۵۱۷، قیمت ۲۷۰ روپیے، پتہ: مقتدرہ

قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان۔

اردو اور سندھی زبانوں کے لسانی اشتراک اور ایک دوسرے پر ان کے اثرات کا یہ مفصل جائزہ فاضل مولف کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۶ء میں اس کے دو اڈیشن شایع ہو چکے تھے، اب مقتدرہ قومی زبان نے اس کا تیسرا اور جدید اڈیشن شایع کیا ہے، سندھی زبان کے تعارف اور اردو زبان کے حروف و حرکات اور صوتیات سے مماثلت، بعض صوتی تغیرات اور صرف و نحو کے قواعد اور مشترک ذخیرۂ الفاظ وغیرہ پر فاضل مصنف نے محنت و کاوش سے موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے، اس سے سندھی اور ابتدائی اردو کے متعلق گوناگوں معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ نگران کے اس خیال "جدید ہندی ہندوؤں کی لنگوافرینکا ہے تو اردو مسلمانوں کی" سے اتفاق کرنا مشکل ہے، البتہ یہ درست ہے کہ "ہندی یا ہندوستانی جو اپنے عناصر ترکیبی کے لحاظ سے اردو اور ہندی کے بین بین ہے، وہ ہندو مسلم سب کی مشترکہ زبان ہے اور پورے برصغیر کی لنگوافرینکا صرف وہی ہو سکتی ہے" کتاب تحقیق و محنت سے لکھی گئی ہے، لیکن کہیں کہیں انداز بیان میں اس طرح کی شوخی و رنگینی بھی پائی جاتی ہے مثلاً اردو سندھی کے تعلقات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ایک طرف سندھ کی وادی میں ان کا سنگم ہو رہا ہے تو دوسری طرف ہند کے میدانوں میں وہ گلے مل رہی ہیں اور عجب نہیں کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد وہ مل ملا کر پھر ایک ہو جائیں"؟ انگریزی اقتباسات کے ترجمے نہیں دیے گئے ہیں۔

چودھری محمد علی ردولوی، حیات اور ادبی خدمات از ڈاکٹر نور حسین خاں

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۰۴، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

چودھری محمد علی ردولوی اودھ کی قصباتی زندگی کے دور آخر کے ان یادگار زمانہ لوگوں میں تھے جو زبان و ادب کے لذت شناس شرافت و رواداری کا نمونہ اور بڑے باغ و بہار شخص تھے، مہدی افادی کی طرح ان کا تحریری سرمایہ زیادہ نہیں تھا لیکن اپنے خاص طرز انشا کی وجہ سے ان کی انفرادی اور امتیازی شان تھی، اس کے باوجود اردو کے بعض مظلوم ادیبوں کی طرح ان کے فضل و کمال کا شایان شان اعتراف نہیں کیا گیا، خوشی ہے کہ ان کے ضلع کے ایک ہونہار نوجوان اہل قلم نے انکی شخصیت کو اپنے پی، ایچ، ڈی کے مقالہ کا موضوع بنایا اور محنت و سلیقہ اور اعتدال و توازن کے ساتھ ان کی علمی و ادبی خدمات کو پیش کیا، اور ان کی افسانہ نویسی، انشا پردازی، مزاح اور خاکہ نگاری اور خطوط نویسی کا عمدہ جائزہ لیا، مقالہ نگار نے چودھری صاحب کے خطوط کے متعلق لکھا کہ "چودھری صاحب کے خطوط میں تقریباً وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو غالب کے خطوط میں پائی جاتی ہیں"۔ چودھری صاحب کی تحریروں کے اقتباسات بھی قرینہ سے پیش کیے گئے ہیں اور حواشی کا اہتمام بھی کیا گیا ہے، تاہم بعض عبارتیں وضاحت طلب رہ گئی ہیں، مثلاً "مصنف (چودھری صاحب) کو سنیوں کے اس عقیدہ سے کہ حضرت عمرؓ فوق الانسان ہیں، اختلاف ہے"، کیونکہ حضرت عمرؓ کا فوق الانسان ہونا سنیوں کا عقیدہ نہیں ہے، اسی طرح ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ "مصنف کے نزدیک حضرت عمرؓ کے دل پر قدیم نملی حکومت کا بہت گہرا اثر تھا اور جس کی تطبیق وہ اسلامی اصول سے ہمیشہ کیا کیے" یہاں قدیم نملی حکومت کی وضاحت ضروری تھی،

رسالہ نقوش کو جریدہ کہا گیا ہے، جریدہ عموماً اخباروں کے لیے استعمال ہوتا ہے، نامانوس الفاظ کی فہرست میں باہم، دبے بہ اور ہرج مرج کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

کرشن چندر کی افسانہ نگاری از جناب ڈاکٹر شفیق اعلیٰ، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۰۰، قیمت ۱۰۰ روپیے، پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸۔

اردو ناول نویسی میں کرشن چندر کا نام ممتاز و نمایاں ہے، لیکن انکی افسانہ نگاری نے بھی ان کے قارئین اور نقادوں کو خاص طور پر متاثر کیا ہے، انسانی نفسیات، سماجی مسائل اور زمانہ کے سیاسی و معاشرتی انقلابات اور ہندوستان کے طبقاتی فرق و امتیاز پر کرشن چندر کی گہری نظر تھی، ان کے افسانوں کی زبان بھی عموماً معیاری اور شگفتہ ہوتی ہے، اسی لیے ان کے خاص ذہنی و فکری رجحان سے قطع نظر افسانہ نگاری میں ان کو قبول عام حاصل ہوا، زیر نظر کتاب میں انکی افسانہ نگاری کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، یہ کتاب لائق مصنف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر گورکھپور یونیورسٹی سے ان کو پی، ایچ، ڈی کی سند ملی، اس میں کرشن چندر کی رومانیت، ترقی پسندی اور زبان و اسلوب کے علاوہ خود اردو افسانہ کے تدریجی ارتقار پر بھی بحث کی گئی ہے، جس کے ضمن میں کرشن چندر سے پہلے کی افسانہ نویسی کا انہوں نے مفصل اور متوازن جائزہ لیا ہے، اقتباسات کے اخذ و انتخاب سے بھی خوش سلیقگی عیاں ہے، جس کے لیے مصنف لائق داد ہیں۔

ع۔ ص۔